یکم و ۱۶ جون ۲۰۲۲ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۵ ۔ شمارہ نمبر: ۱۱۔۱۲

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

جنوبی ایشیا کا معاشی بحران
سری لنکا، پاکستان کے بعد نیپال کی باری!

Monica Verma

نیپال، پاکستان اور سری لنکا کے برعکس بنگلا دیش اور بھارت نے اپنی برآمدات کی حوصلہ افزائی، برآمدات کی تیاری میں تیزی اور مختلف طریقوں سے کثیر تعداد میں مختلف برآمدات میں اضافے پر توجہ مرکوز کی ہوئی ہے۔

اس وقت جب کے بھارت سری لنکا میں معاشی بحران سے نبرد آزما ہے ایک اور ملک ہمارے پڑوس میں اسی طرح کے معاشی بحران سے دوچار ہونے جا رہا ہے اور یہ ملک ہمارے شمال میں ہمارا پڑوسی نیپال ہے یہ ملک بلکل اسی طرح کی علامات ظاہر کر رہا ہے جو بدترین معاشی بحران سے پہلے نظر آتی ہیں، نیپال میں زرمبادلہ ۲۰۲۱ء جولائی سے ۲۰۲۲ء مارچ تک ۱۸ رفیصد تک گر گیا ہے، ان کے پاس صرف چھ مہینے کی درآمدات رہ گئی ہیں، افراط زر ۶۷ مہینوں میں ۷ فیصد یعنی بلند ترین سطح پر ہے، سیلاب کے باعث فصلیں تباہ ہوگئیں یوکرائن روس جنگ کی وجہ سے ایندھن اور خوراک کی افراط زر پہلے ہی بڑھ چکی ہے۔

حکومت نے عیش و عشرت کے لیے استعمال ہونے والی چیزوں جیسے گاڑیاں، میک اپ کا سامان اور سونا چاندی کی درآمدات پر پابندی لگا دی ہے، ہفتہ وار تعطیلات میں اضافہ کر دیا گیا ہے، کام کرنے کے دن کم کر کے پانچ کر دیے گئے ہیں جس سے ایندھن کی بچت ہو سکے گی، بیرونی قرضوں کی وجہ سے نیپال سری لنکا کے راستے پر گامزن ہے۔ انہی قرضوں کی وجہ سے ۲۰۱۵ء سے ۲۰۲۲ء تک قرضوں اور جی ڈی پی کا تناسب ۲۵ فیصد سے ۴۰ فیصد تک بڑھ گیا۔ حکومت کے مطابق سب کچھ ٹھیک ہے، اپوزیشن افواہیں پھیلانے سے گریز کرے لیکن ایک انتخابی سال میں یہ سب اس وقت تشویشناک ہو جاتا ہے جب حکومت اپنے سرکاری اعداد و شمار میں نمو کا تخمینہ ۶ فیصد لگاتی ہے اور آزاد ماہرین اسے ۴ فیصد بتاتے ہیں۔

سری لنکا اور نیپال اس وقت معاشی بدحالی کا شکار ہیں، پڑوس میں ایک ریاست مثالی طور پر موجود ہے جو آئی ایم ایف سے قرضے لینے کی عادی ہے، جس کی تیرہویں ضمانت آئی ایم ایف نے عالمی بینک اور ایشیا بینک کے ساتھ مل کر روک دی ہے۔ پاکستان کے پاس زرمبادلہ کے ذخائر کم ترین سطح پر ہیں اور جون سے آگے نہیں چلیں گے پاکستان کا تجارتی خسارہ ۳۹ ملین تک پہنچ گیا ہے اور یہ سب کچھ عمران خان کی مقبول پالیسوں کی بدولت ممکن ہوا اس بدترین صورتحال میں نئے وزیراعظم شہباز شریف کی پہلی ترجیح یہ ہے ۴ء۲ بلین ڈالر کے قرض پر سعودی عرب سے مدد لی جائے اور سعودی عرب نے اس صورتحال کے پیش نظر پاکستان کی مدد کی ہے۔

ایک اور پڑوسی ملک مالدیپ بھی اسی معاشی بحران کا شکار ہے اور محفوظ پوزیشن میں نہیں، جنوبی ایشیا کی تمام معیشتوں میں تیل کی درآمد جی ڈی پی میں سب سے زیادہ حصہ پاتی ہے، جس کا ۲۰ فیصد روس اور یوکرین سے آنے والے سیاحوں کی بدولت ہے اور ان دونوں ملکوں کو اس وقت جنگ کی تباہیوں کا سامنا ہے۔

کورونا وبا سے پہلے ہی جنوبی ایشیا کی معاشی حالت خراب تھی اور ۲۰۱۹ء میں عالمی بینک نے اپنی ایک رپورٹ میں اس معاشی بحران کا ذکر کیا تھا۔ ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۹ء تک جنوبی ایشیا نے ''تیزی سے ترقی کرنے والے خطے'' کے لقب کا لطف اٹھایا ہے یہاں تک اسے مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل سے شکست کا سامان کرنا پڑا۔ سری لنکا اور نیپال معاشی بدحالی کا ذمہ دار کورونا کو بتاتے ہیں ان کے مطابق ان کی ترسیلات کا ایک بڑا ذریعہ سیاحت تھا، پاکستان کی معیشت کورونا سے پہلے ہی بدحالی کی طرف جا رہی تھی، عالمی بینک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق جنوبی ایشیا کی معاشی بدحالی کی وجہ کورونا اور روس یوکرین جنگ ہے لیکن یہ وجہ بہت سطحی ہے۔

اگر وسیع بنیادوں پر اس کا جائزہ لیں تو ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیلتی معاشی بدحالی ان کی ساختی یا بالترتیب ناکامی کی علامت ہے مثال کے طور پر سری لنکا پریشانی کا الزام چین پر لگاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سری لنکا کے تمام بیرونی قرضوں میں چین کا صرف ۱۰ فیصد قرض شامل ہے، اسی طرح پاکستان اپنے قرضوں کا ذمہ دار سی پیک راہداری کو ٹھہراتا ہے جو کہ ٹھیک نہیں ہے، پاکستان کی سیاسی معیشت فوج اور اس کے پسندیدہ تاجروں کی وجہ سے لرزاں ہے۔ دنیا بھر میں بڑی تجارتوں اور

اندرونی صفحات پر

- چین تین برس میں سولر اور ونڈ انرجی کی صلاحیت دوگنی کر لے گا
- ایشیا میں چین کا بڑھتا اثر و رسوخ
- بدلتی دنیا۔ نئے بلاک کی تشکیل
- ہندوستان کے لیے خطرے کی علامت۔۔؟
- ہندتو کا ہندوستان اور مسلمان
- برقی گاڑیوں کی ریس
- بھارت: تاریخی مساجد اور مسلم دور کے شاہکار نشانے پر

صنعتوں کو ۱۳ ٹریلین روپے سے زیادہ کی سالانہ امداد دینا ایک بدترین نااہلی تصور کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان نے بیرونی قرضے صرف ان دو سالوں میں نہیں لیے ہیں۔

بیرونی قرضوں کی ادائیگی کا سارا بوجھ برآمدات اور ترسیلات زر پر ہے، برآمدات کے ناقص ہونے کی وجہ سے ان ملکوں کی معیشت کا کل انحصار بیرونی قرضوں اور ترسیلات زر پر ہے یہ تینوں ممالک یعنی نیپال، سری لنکا اور پاکستان اپنے برآمدات کی بری کارکردگی کی وجہ سے معاشی بحران کا شکار ہیں۔ ۲۰۰۰ء میں سری لنکا کا جی ڈی پی ۳۹ فیصد تھا، جو برآمدات کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے ۲۰۲۰ء میں گر کے ۱۶ فیصد رہ گیا۔ نیپال کی جی ڈی پی کا تناسب ۲۰۰۰ء میں ۲۳ فیصد تھا جو ۲۰۱۱ء میں گھٹ کر ۶ اعشاریہ ۳ فیصد رہ گیا لیکن سیاحت کے شعبے کی وجہ سے یہ تھوڑا بڑھا اور اس میں ۷ فیصد تک بہتری ہوئی۔ پاکستان کا جی ڈی پی ۲۰۰۳ء میں ۱۵ فیصد تھا جب کہ یہ خسارے کے ساتھ ۱۰ فیصد تک رہ گیا ان ممالک کے برعکس بنگلا دیش کا جی ڈی پی تناسب ۲۰۰۰ء میں ۱۲ فیصد تھا جو اَب بہتری کے ساتھ ۲۰۱۹ء میں ۱۵ فیصد تک گیا۔

گرتی ہوئی برآمدات نے ان ملکوں کی معیشت کو مزید مشکلات سے دوچار کر دیا ہے واضح طور پر اب اس بات کی ضرورت ہے کہ کمال ہوشیاری سے معاشی پالیسیوں کی از سر نو تعمیر کی جائے اس کے لیے زر مبادلہ کے ذریعہ تجارت کو فروغ دیا جائے۔ ان ملکوں میں بڑھتا ہوا تجارتی خسارا اس بات کی ضرورت پر زور دیتا ہے کہ غیر ضروری درآمدات پر پابندی لگائی جائے، ٹیکس پالیسیوں کے ذریعے گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کی مدد کی جائے۔ جنوبی ایشیا کی معیشت ترسیلات زر اور سیاحت کو استعمال کرتے ہوئے بیرونی قرضے مانگتی ہے جو کہ پریشان کن ہے۔ ان معیشتوں کو چاہیے کہ متنوع برآمدات کے ذریعے ایک مثالی معاشی و تجارتی پالیسی بنائی جائے لیکن ان ممالک کی اشرافیہ کا عوامی رجحان یہ ہے کہ بری سیاست اچھی معیشت پر غالب آ جائے۔

جنوبی ایشیا کے معاشی بحران نے اس پورے براعظم میں جنوبی ایشیا کی حیثیت گرا دی ہے، نیپال، پاکستان اور سری لنکا کے برعکس بنگلا دیش اور بھارت نے اپنی برآمدات کی حوصلہ افزائی کی ہے، برآمدات کو بڑھانے پر زور دیا ہے دونوں ممالک ایک دوسرے کے ساتھ جامع معاشی پالیسیوں کے معاہدوں پر دستخط کر رہے ہیں اور انہی معاہدوں کی بنیاد پر یہ برآمدات کی تیاری، دفاعی سامان اور دواؤں کی خرید و فروخت کر رہے ہیں، ایک دوسرے کی مدد کے ذریعے بنگلا دیش بھارت کی تجارتی مارکیٹ تک رسائی اور منافع پائے گا جب کہ بھارت اپنی ایکٹ مشرقی پالیسی میں بنگلا دیش سے فائدہ اٹھائے گا۔

جنوبی ایشیا کے ممالک کا معاشی بحران بہت سنگین ہے لیکن انہیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ سب ان کا اپنا کیا دھرا ہے اسی جنوبی ایشیا میں بھارت اور بنگلا دیش کی بڑھتی معیشت ان کے سامنے ایک مثال ہے جو انہیں اپنانی چاہیے ان ممالک کو اپنی کسی کو ساتھ لے کر نہ چلنے کی روایت اور تنگ نظری کی عینک کو ترک کرنا ہوگا اور جغرافیائی دشمنیوں سے آگے جا کر دیکھنا ہوگا۔

(ترجمہ: سمیہ اختر)

"After Pakistan, Sri Lanka, is Nepal next? Why South Asia's economic woes are structural". ("news18.com". May 09, 2022)

چین تین برس میں سولر اور ونڈ انرجی کی صلاحیت دوگنی کر لے گا

چین نے اپنی توانائی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نیا منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس کے تحت وہ ۲۰۲۵ء تک اپنی ونڈ اور سولر انرجی کی صلاحیت دوگنی کر لے گا جبکہ تھرمل پاور پلانٹوں سے بھی زیادہ بجلی پیدا کرے گا۔ چین نے توانائی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا جو نیا منصوبہ تیار کیا ہے اگر وہ نافذ العمل ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ پیرس ماحولیاتی معاہدے کے اہداف کو قبل از وقت حاصل کر لے گا۔ چین کو یہ ہدف ۲۰۳۰ء تک حاصل کرنا ہے تاہم وہ ونڈ اور سولر انرجی کی صلاحیت کو دوگنی کر کے اسے ۲۰۲۵ء تک حاصل کرنا چاہتا ہے۔

حالانکہ یوکرین جنگ کے سبب توانائی کی قیمتوں میں اضافہ ہو جانے اور اپنی معیشت کو تقویت پہنچانے کے لیے بیجنگ نے حالیہ مہینوں میں تھرمل پاور پلانٹوں یا کوئلے سے چلنے والے بجلی پیدا کرنے والے کارخانوں پر بھی انحصار بڑھا دیا ہے۔ چین میں منصوبہ بندی کے مرکزی ادارے کے طرف سے جاری کردہ ایک دستاویز کے مطابق ۲۰۲۵ء تک ملک کے قومی گرڈ کو ۳۳ فیصد بجلی کی فراہمی قابل تجدید توانائی کے ذرائع سے ہونے لگے گی، جو ۲۰۲۰ء میں ۲۹ فیصد تھی۔

نئے منصوبے میں کہا گیا ہے، ''۲۰۲۵ء میں قابل تجدید توانائی کے ذرائع سے بجلی کی سالانہ پیداوار تقریباً ۳ء۳ ٹریلین کلوواٹ فی گھنٹہ ہو جائے گی اور ونڈ اور سولر انرجی کی مقدار دوگنی ہو جائے گی۔''

چین اس وقت بھی دنیا میں سب سے زیادہ قابل تجدید توانائی پیدا کرنے والا ملک ہے۔ اس نے آلودگی پر قابو پانے کے لیے سولر اور ونڈ انرجی کے پروجیکٹوں میں سرمایہ کاری تیز کر دی ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ چین اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ آلودگی پیدا کرنے والا ملک ہے اور ہر سال لاکھوں لوگ آلودگی کے سبب موت کا شکار ہو رہے ہیں۔ بیجنگ نے ملک کو ۲۰۳۰ء تک کاربن کے اخراج کو کم ترین سطح پر لے جانے اور ۲۰۶۰ء تک کاربن نیوٹرل بنانے کا عہد کیا ہے۔

نیشنل انرجی ایڈمنسٹریشن کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ گزشتہ برس جنوری سے اپریل کے درمیان سرمایہ کاری کے مقابلے میں اس برس کے ابتدائی چار مہینوں کے دوران شمسی توانائی کے پروجیکٹوں میں سرمایہ کاری تقریباً تین گنا ہو کر ۴ء۳ بلین ڈالر ہو گئی ہے۔ لیکن چین کی توانائی کی پالیسی میں اب بھی کئی خامیاں ہیں۔ یہ ملک اپنی معیشت کو بجلی فراہم کرنے کے لیے کوئلے کا جتنا استعمال کرتا ہے وہ دنیا بھر میں استعمال کیے جانے والے کوئلے کا تقریباً نصف ہے۔

یوکرین کی جنگ کے سبب تیل اور قدرتی گیس کی قیمتوں میں اضافہ کے مدنظر چین کے پالیسی ساز کوئلے کے استعمال پر مزید انحصار کرنے پر زور دے رہے ہیں۔

وزیر اعظم لی کی چیانگ نے گزشتہ ہفتے بتایا تھا کہ اقتصادی پریشانیوں پر قابو پانے کے لیے ملک کے مرکزی بینک نے کوئلے کی کان کنی اور کوئلے سے چلنے والے بجلی کے کارخانوں کے لیے ۱۵ ارب ڈالر کے قرضوں کو منظوری دی ہے۔ مارچ میں کابینہ نے ہر سال اضافی ۳۰۰ ملین ٹن کوئلہ نکالنے کا حکم دیا تھا۔ مقامی حکومتوں نے بھی گزشتہ برس ہی نئے تھرمل پاور پلانٹوں کی تعمیر شروع کر دی تھی۔

توانائی اور صاف ہوا پر تحقیقات کے مرکز میں تجزیہ کار لاوری مائیلی ورتا کا کہنا ہے، ''انرجی سکیورٹی چین کی سب سے اہم اور ضروری ترجیح ہے۔ منصوبہ ساز زیادہ تیز رفتار ترقی کی تیاری کر رہے ہیں جس کے لیے توانائی کے روایتی ذرائع کا زیادہ استعمال ہوگا اور اس سے نقصان دہ گیسوں کے اخراج میں اضافہ ہوگا۔''

"China to double wind, solar energy capacity by 2025". ("AFP". June 2, 2022)

ایشیا میں چین کا بڑھتا اثر و رسوخ

Susannah Patton

امریکی صدر جو بائیڈن نے کہا ہے کہ امریکا چین کو ۲۱ ویں صدی میں کامیاب نہیں ہونے دے گا اور نہ ہی صورتحال کے خراب ہونے کا انتظار کرے گا۔ ان کے ایشیا کے پہلے دورے کا مقصد بھی اپنے ان الفاظ کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ صدر بائیڈن نے گزشتہ ہفتے چار ملکی اتحاد کواڈ کے رہنماؤں سے ملاقات کی۔ اس گروپ کا مقصد چین کا مقابلہ کرنا ہے۔ اس ملاقات میں انہوں نے اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ چین کے خلاف تائیوان کا دفاع کیا جائے گا۔ انہوں نے ایک نئے معاشی پیکج کا بھی اعلان کیا جس کا مقصد خطے میں امریکی معاشی اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے بارہ ممالک کا تعاون حاصل کرنا ہے، تاہم چین پہلے ہی معاشی اور سفارتی محاذوں پر کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہا ہے اور امریکا کا کوئی بھی اقدام اس کی کامیابی کو روکنے میں کارگر ثابت نہیں ہو رہا ہے۔

لوئی انسٹی ٹیوٹ کا ایشیا پاور انڈیکس، جس کا مقصد ریجنل پاور کی حرکیات کا تخمینہ لگانے کے لیے معاشی ڈیٹا کو ٹریک کرنا ہے، کے مطابق ۲۰۱۸ء کے بعد اس خطے میں امریکی اثر و رسوخ میں بہت کمی آ گئی ہے جبکہ چین اس سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔ ۲۰ سال قبل جنوب مشرقی ایشیا سے صرف ۵ فیصد اشیاء چین کو برآمد ہوتی تھیں جبکہ امریکا کو ۱۶ فیصد اشیاء برآمد ہوا کرتی تھیں۔ ۲۰۲۰ء تک چین کو ان کی مقدار ۱۵ فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ اگر تجارت کے کل حجم کو دیکھا جائے تو چین کا بڑھتا ہوا اثر و رسوخ بالکل عیاں ہے۔ اس خطے میں امریکا کے مقابلے میں چین کی تجارت کا حجم ڈھائی گنا زیادہ ہے۔ اس وقت چین ہر ایشیائی ملک کا سب سے بڑا تجارتی شراکت دار بن چکا ہے۔ ایشیا میں امریکی برتری کی بڑی وجہ امریکا کے نجی شعبے کی سرمایہ کاری ہے مگر اب اس کی یہ برتری تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ ۲۰۱۸ء میں چین سے خطے کے دوسرے ممالک کی طرف سرمائے کا بہاؤ امریکا کے مقابلے میں نصف تھا۔ اب یہ امریکی شیئر کا ۷۵ فیصد تک ہو چکا ہے اور اس میں متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔

امریکا کے لیے لازم ہے کہ وہ کھل کر چین کا مقابلہ کرے۔ صدر بارک اوباما کو اس امر کا حقیقی ادراک تھا، چنانچہ انہوں نے ٹرانس پیسفک پارٹنرشپ (ٹی پی پی) معاہدہ کیا جو خطے کا سب سے بڑا تجارتی بلاک ہوتا مگر صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے یہ کہتے ہوئے اس معاہدے کو خیرباد کہہ دیا کہ اس معاہدے سے امریکا میں مسابقت کا خاتمہ ہو جائے گا اور ملازمتیں امریکا سے باہر منتقل ہو جائیں گی۔ یہ چین کے لیے ایک بڑا تحفہ تھا۔ چین پہلے ہی ایک الگ تجارتی گروپ کی سب سے بڑی معیشت ہے جسے ریجنل کمپری ہینسو اکنامک پارٹنرشپ کہا جاتا ہے اور پچھلے سال اس نے ٹی پی پی کے بعد ہونے والے معاہدے میں شمولیت کی درخواست کر دی۔ اس معاہدے میں اصل معاہدے کی بنیادی شقیں شامل رکھی گئیں۔ آج امریکا ان دونوں معاہدوں سے باہر ہے۔ بائیڈن حکومت نے گزشتہ ہفتے ٹوکیو میں اس کا جواب انڈو پیسفک اکنامک فریم ورک کی صورت میں دیا۔ یہ منصوبہ تجارت، سپلائی چین، انفرااسٹرکچر اور بدعنوانی کے خاتمے کا تقاضا کرتا ہے مگر اس میں امریکا کی وسیع تر امپورٹ مارکیٹ تک بہتر رسائی شامل نہیں ہے۔ امریکی حکام کا کہنا ہے کہ یہ منصوبہ ماضی کے ماڈلز کے مقابلے میں ۲۱ ویں صدی کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتا ہے مگر بڑے ایشیائی پارٹنر کو یہ دیکھنے میں مشکل کا سامنا ہے کہ اس منصوبے میں ان کے لیے کیا ہے۔ اسٹاک مارکیٹ شیئرز کی قلت کی بنا پر امریکا کی اس صلاحیت کے متاثر ہونے کا بھی خدشہ ہے کہ وہ ڈیجیٹل اکانومی جیسے ایشوز کے لیے قواعد وضوابط وضع نہیں کر سکے گا۔

دریں اثنا چین نے خاصی پیشرفت کی ہے۔ ریاستی ملکیت والی کمپنیوں نے خطے کے بڑے بڑے پروجیکٹس بیلٹ اینڈ روڈ انیشی ایٹو کی چھتری تلے اپنے قبضے میں کر لیے ہیں۔ چین سفارت کاری کا بھی مسلسل استعمال کر رہا ہے۔ چینی وزیر خارجہ وانگ ژی نے جنوب مشرقی ایشیا اور پیسفک ریجن کے ممالک کا اس قدر طوفانی دورہ کیا کہ انہوں نے اپنے امریکی ہم منصب کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ ۱۶ مہینے قبل منصبِ صدارت سنبھالنے کے بعد صدر جو بائیڈن کا اس خطے میں یہ پہلا دورہ تھا اور انہوں نے صرف امریکا کے قریبی اتحادیوں جاپان اور جنوبی کوریا ہی کا دورہ کیا۔ چین میں ایک طاقتور اشرافیہ بھی پروان چڑھ رہی ہے۔ فلپائن میں منتخب ہونے والے صدر اور نائب صدر، دونوں نے اپنے اپنے حلقہ انتخاب میں چین کی بھاری سرمایہ کاری سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ کمبوڈیا اور سولومن آئی لینڈز میں چین نے اپنی سرحدوں سے ہزاروں میل دور اپنی عسکری موجودگی کے انتظامات کر لیے ہیں۔ انڈونیشیا کے وزیر برائے میری ٹائم و سرمایہ کاری کے ساتھ بھی چین کے قریبی تعلقات ہیں جس کی وجہ سے چین کو اپنی کمپنیوں کے 5G نیٹ ورکس معاہدوں میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، تاہم امریکا کو بعض امور میں چین پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کے پاس آزمودہ اتحادی ہیں جنہیں بائیڈن حکومت ہم خیال جمہوری ممالک کہتی ہے جن میں کواڈ کے رکن ممالک جاپان، جنوبی کوریا، آسٹریلیا اور بھارت شامل ہیں۔

کواڈ کو ابھی اپنا حقیقی رنگ دکھنا ہے۔ خطے کے ممالک کو اس سال کے آخر تک ایک ارب ویکسین کی فراہمی ابھی پائپ لائن میں ہے کیونکہ بھارت میں اس کی مینوفیکچرنگ میں کافی مسائل آ رہے ہیں۔ درحقیقت کواڈ سے امریکا کی کمزوریوں کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ خطے کے دیگر جمہوری ممالک کے مقابلے میں امریکا ایک مضبوط ملک ہے مگر جنوب مشرقی ایشیا کے مرکز میں امریکا ایک کمزور حیثیت کا حامل ہے۔ وقت کے ساتھ مضبوط ہونے والا چین ضرورت پڑنے پر امریکا کے لیے علاقائی بحری اڈوں تک رسائی میں رکاوٹ ڈال سکتا ہے۔ ان ممالک میں کاروبار کرنے والی امریکی کمپنیوں کے لیے مسائل کھڑے کر سکتا ہے اور سفارت کاروں کے لیے اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کی ادائیگی میں مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ جب تک امریکا کی معیشت اور اسٹیٹ کرافٹ میں بہتری نہیں آئے گی، اس کا ایشیا میں اثر و رسوخ عدم استحکام کا شکار رہے گا۔ خطے کے لیے ایک کمزور معاشی منصوبے کے برعکس صدر بائیڈن کو اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا کرنا چاہیے کہ وہ ٹی پی پی کے بعد ہونے والے معاہدے میں دوبارہ شمولیت اختیار کر لیں اور امریکا میں اپنے داخلی مخالفین پر یہ بات واضح کر دیں کہ ایسا کرنے سے اس کے پاس چین کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک موثر ہتھیار آ جائے گا۔ امریکا کو جنوب مشرقی ایشیا اور بحرالکاہل کے غیر اتحادی مگر موثر ممالک کے ساتھ بھی اپنا اشتراکِ عمل بڑھانا چاہیے جہاں چین اپنے قدم مضبوطی سے جمانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ ایشیا میں چین کے ساتھ مقابلہ اور مسابقت کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا مگر اس کا آغاز اس ادراک کے ساتھ کرنا ہوگا کہ فی الحال امریکا یہاں ہار رہا ہے۔

"China is winning in Asia. Biden's plans won't change that". ("New York Times". June 1, 2022)

بدلتی دنیا۔ نئے بلاک کی تشکیل

دوسرا اور آخری حصہ

ابو صباحت

پہلی جنگِ عظیم کے بعد امریکا اور یورپ کی پوزیشن ایسی مضبوط ہوئی کہ باقی دنیا یہ سوچنے لگی کہ اب دو تین صدیوں تک کوئی بھی حوصلہ افزا تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ امریکا اور یورپ نے مل کر مغربی تہذیب کو جنم دیا اور اِسے باقی دنیا پر مسلط کرنے کی کوششیں بھی شروع کیں۔ یہ تہذیب چونکہ الحاد کے بطن سے پیدا ہوئی تھی اس لیے اس کی تعلیمات اصلاً اُن تمام اخلاقی حدود و قیود کے منافی تھیں جو مذہب کا عطیہ تھیں اور ہیں۔ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے ایک ایسی دنیا معرضِ وجود میں لانے پر توجہ دی جس میں مذہب یا تو نہ ہو یا پھر برائے نام ہو۔ دنیا بھر میں عام آدمی کے ذہن میں یہ بات نصب کر دی گئی کہ مذہب کسی بھی اعتبار سے ناگزیر ضرورت نہیں اور یہ کہ اخلاقی حدود و قیود کا تعین انسان خود کر سکتا ہے۔ مذہبی طبقے نے بھی جو جہالت دکھائی اُس کے نتیجے میں مذہب سے بیزار افراد کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے یورپ کے قصے سُنا سُنا کر لوگوں کو مذہب سے مزید بیزار کیا۔ اس بات سے بھی ڈرایا گیا کہ اگر مذہبی طبقے کو کھل کر کام کرنے کی اجازت دی گئی تو ایک بار پھر دورِ جہالت پلٹ آئے گا۔ اس حوالے سے پس ماندہ خطوں میں مذہبی طبقے کی کارستانیوں نے بھی عبرت ناک مثالوں کا کردار ادا کیا۔ جنوبی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ میں مذہبی طبقے نے جس انداز سے معاشروں کو منقسم کر رکھا ہے وہ بھی اہلِ مغرب کو مذہب سے مزید بیزار کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا کہ فطری علوم و فنون میں ترقی اور مذہب کا آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ مذہب اصلاً انسان کی اخلاقی تربیت کے لیے ہے۔ مذہبی تعلیمات فطری علوم و فنون میں پیش رفت کے لیے کوئی بلا واسطہ کردار ادا نہیں کر سکتیں۔ مذہب کا میدان اخلاق ہے، روحانی ارتقا ہے، باطنی تطہیر ہے۔ اہلِ مغرب نے اپنی زندگی سے مذہب کو نکالنے کے لیے اخلاقی و روحانی اقدار سے بھی منہ موڑ لیا۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ مادّی سُکھ ہی سب کچھ ہے۔ اعلیٰ درجے کا معیارِ زندگی یقینی بنانے کے نام پر مذہب کو مکمل طور تج دینا ناگزیر قرار دے دیا گیا۔ مغرب کے اہلِ دانش نے مادّی آسائشوں میں گم ہو کر مذہب کو بالکل ترک کر دیا گیا۔ اِس وقت بھی مغرب میں عمومی تصور یہ ہے کہ مذہب کو زندگی کا حصہ بنانے سے صرف اور ذہنی پس ماندگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب کچھ عمل سے زیادہ ردِعمل ہے۔

اہلِ مغرب کے فکر و عمل کا تضاد بھی نمایاں ہے۔ ایک طرف تو اُن کا دعوٰی ہے کہ دنیا بھر کے انسانوں کو یکساں سہولتیں ملنی چاہییں۔ سب کے لیے اعلیٰ درجے کا معیارِ زندگی یقینی بنایا جانا چاہیے۔ اور دوسری طرف یہ بھی ایک تلخ اور شرم ناک حقیقت ہے کہ مغربی اقوام نے باقی دنیا کے قدرتی وسائل لُوٹ کر اپنا تاج محل تعمیر کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ عالمی سیاست و معیشت پر تصرف قائم کر کے مغرب صرف اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی فکر میں غلطاں رہتا ہے۔ اُسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ پس ماندہ خطوں میں کس طور جیتے ہیں۔ اگر کہیں بیماریوں سے لاکھوں افراد مرتے ہیں تو مریں۔ جہالت اور پس ماندگی برقرار رکھنے پر پوری توجہ دی جاتی ہے تاکہ کوئی بھی خطہ مغربی تسلط کو منہ دینے کے قابل نہ ہو سکے۔ اس حوالے سے مسلم دنیا خصوصی طور پر اہلِ مغرب کے نشانے پر رہی ہے۔

امریکا اور یورپ کی بالا دستی ہی نے کئی ممالک کو زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول یقینی بنانے کی تحریک دی ہے۔ ان میں چین اور روس نمایاں ہیں۔ سابق سوویت یونین کے عہد میں روس بہت مضبوط تھا۔ ٹیکنالوجی کے شعبے میں بھی کسی حد تک مغرب کو منہ دینے کی پوزیشن میں تھا۔ مغرب نے کمال ہوشیاری سے سرد جنگ کے عہد میں منصوبہ سازی اور سوویت یونین کی تحلیل یقینی بنائی۔ سوویت یونین کی تحلیل کے بعد روس کی پوزیشن ایسی نہ رہی کہ مغرب کو چیلنج کر سکے۔ پھر بھی اُس نے اپنی سی کوشش جاری رکھی تاکہ جلد از جلد مغرب کو للکارنے کی پوزیشن یقینی بنائی جا سکے۔

سرد جنگ کے خاتمے سے ڈیڑھ دو عشرے قبل ہی چین نے خود کو مضبوط بنانا شروع کر دیا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی آبادی کسی زمانے میں چین کے لیے بوجھ تھی۔ پھر چین نے اس بوجھ کو نعمت میں تبدیل کیا۔ چینیوں نے عشروں کی محنت کے نتیجے میں دنیا بھر میں تجارت، صنعت کاری اور سرمایہ کاری کے حوالے سے مقام بنایا ہے اور ثابت کیا ہے کہ کوئی ملک اگر چاہے تو لڑے بغیر بھی اپنی پوزیشن قابلِ رشک حد تک بہتر بنا سکتا ہے۔ چینی قیادت نے چار عشروں کی محنتِ شاقّہ کے نتیجے میں وہ مقام پایا ہے جہاں وہ امریکا اور یورپ دونوں کے لیے سب سے بڑے خطرے اور چیلنج کے روپ میں ابھری ہے۔ چین کی ترقی کے حوالے سے سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اُس نے اب تک کسی بھی ملک کے لیے کوئی ایسی ناموافق صورتِ حال پیدا نہیں کی جو تصادم کی طرف لے جاتی ہو۔ امریکا اور یورپ کو چین نے معیشت کے محاذ پر پچھاڑا ہے اور اِس طور پچھاڑا ہے کہ وہ اٹھنے، سنبھلنے کے قابل نہیں ہو پا رہے۔ امریکا نے مختلف النوع پابندیوں کے ذریعے چین کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی ہے مگر یہ کوشش تا حال مطلوب حد تک بار آور ثابت نہیں ہو سکی۔

روس نے بھی اپنی طاقت بحال کرنے پر توجہ دی ہے۔ چین کے ساتھ مل کر وہ امریکا اور یورپ کے لیے ایک بڑے چیلنج کی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔ روس بھی مسیحی ہے اور اہلِ مغرب بھی اصلاً مسیحی ہیں مگر روس کو مغرب نے اب تک اپنا نہیں مانا۔ اُسے ایشیائی تصور کیا جاتا ہے۔ روس کو عالمی معیشت و معاشرت میں اپنی مرضی کا کردار ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ سوال بہت حد تک گرم پانیوں کا بھی ہے۔ روس کا محلِ وقوع اُس کے لیے بہت سی کمزوریاں پیدا کرتا ہے۔

چین نے اپنی بھرپور معاشی اور تکنیکی قوت کی مدد سے اب دفاعی صلاحیتوں کو بھی قابلِ رشک بنانے کی سمت سفر شروع کر دیا ہے۔ روس اس کے ساتھ ہے۔ اب یہ دونوں ملک کر مغرب کو ہر معاملے میں چیلنج کرنے کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ یوکرین کے بحران کے ذریعے روس دراصل مغرب کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اُسے اور چین کو تادیر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچا جا رہا ہے کہ ایک نیا بلاک بنانے کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ پاکستان اپنے محلِ وقوع کی بنیاد پر بہت اہم ہے۔ وہ روس اور وسطِ ایشیا کے لیے گرم پانیوں تک رسائی کا ذریعہ ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ گیٹ وے بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ چین کے لیے بھی پاکستان بہت اہم ہے۔ چین پاک اقتصادی راہ داری (سی پیک) کی تکمیل سے چین کو بہت کچھ بہت آسانی سے مل سکے گا۔ امریکا اور یورپ کی ایما پر بھارتی قیادت بلوچستان میں گڑبڑ پھیلا کر سی پیک کو ناکام بنانے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کوششیں اب تک ناکام رہی ہیں کیونکہ چین اور روس ہر حال میں ایسے حالات چاہتے ہیں جن میں پاکستان پُرسکون ہو۔ پاکستان میں امن دونوں طاقتوں کے لیے ناگزیر ہے۔

یوکرین کے بحران کی کوکھ سے ایک اچھی بات یہ برآمد ہوئی ہے کہ پاکستان نے ہوش کے ناخن لینے کی ٹھانی ہے۔ امریکا اور یورپ بات بات پر پاکستان کو بلیک میل کرتے

آئے ہیں۔ کسی بھی علاقائی اتحاد میں شمولیت سے بھی پاکستان کو روکا جاتا رہا ہے۔ ''سارک'' کو بھی امریکا اور یورپ نے کبھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔

چین اور روس کی بڑھتی ہوئی طاقت پاکستان کے لیے بھی بہت خوش آئند ہے کیونکہ اِن دونوں کی طرف جھک کر وہ اپنے لیے بہتر پوزیشن یقینی بنا سکتا ہے۔ پاکستان کے وزیراعظم نے یوکرین کے بحران کے شدید ترین لمحات میں روس کا دورہ کر کے مغربی طاقتوں کو واضح پیغام دیا ہے کہ اب ہر معاملے میں اُن کی نہیں سُنی جائے گی۔ عالمی مالیاتی اداروں پر مغربی طاقتوں کا تسلط ایک ایسی حقیقت ہے جو پاکستان کے لیے انتہائی نوعیت کی کمزوری کا سامان کرتی رہی ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ اسلام آباد نے راستہ بدلنے کی ٹھانی ہے۔ چین میں سرمائی اولمپکس کے سفارتی بائیکاٹ کے مغرب کے فیصلے کو بھی پاکستان نے قبول نہیں کیا اور افتتاحی تقریبات میں پاکستانی وزیراعظم اور روس کے صدر ولادیمیر پیوٹن بھی نمایاں رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چین، روس اور پاکستان نے ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر مغرب کو پیغام دیا ہے کہ اب اُسے زیادہ دھمکانے اور دبوچنے کی کوشش نہ کی جائے۔ آئی ایم ایف سے اُس کی شرائط پر قرضے لینے کی روش نے پاکستان کو انتہائی کمزور کیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مزید بلیک میل ہونے کے بجائے قدرے کھل کر مغرب کو للکارا جائے۔ پاکستان بدلتی ہوئی علاقائی اور عالمی صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کے لیے منصوبہ سازی اور تحمل درکار ہے۔

روس اب پیچھے ہٹنے کا تیار نہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ عالمی سیاست و معیشت میں اس کے لیے کچھ نہ کچھ معقول گنجائش پیدا کی جائے۔ چین اُس کے ساتھ کھڑا ہے۔ یہ گویا ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ عالمی سیاست و معیشت کے نئے دور کے آغاز میں ہمارے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہے۔ پاکستان نے سات عشروں کے دوران بہت کچھ جھیلا ہے۔ امریکا اور یورپ کے ہاتھوں پاکستان کے مفادات کو قدم قدم پر ذبح کیا گیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ اِس پورے نقصان کا ازالہ ممکن بنایا جائے۔ چین اور روس کے ساتھ کھڑے رہنے کی ضرورت ہے۔ ردِعمل کا سامنا تو کرنا ہے۔ امریکا اور یورپ کی طرف سے تادیبی اقدامات بھی کیے جا سکتے ہیں مگر ان اقدامات کا سامنا کرنے میں کچھ ہرج نہیں کیونکہ ہم مغرب کے گُن گائیں اور تلوے چاٹیں تب بھی ذلت ہی ہاتھ لگتی ہے۔ تو پھر کیوں نہ مخالف کیمپ میں کھڑے ہو کر سختیاں جھیلی جائیں؟

روس نے یوکرین پر باضابطہ حملہ کر دیا۔ اس حملے کے حوالے سے امریکا اور یورپ دونوں ہی شدید مخمصے کی حالت میں ہیں۔ یورپ منقسم ہے کیونکہ یورپ کے ایک بڑے حصے کو روس کی طرف سے گیس کی رسد ملتی ہے۔ اگر یہ رسد داؤ پر لگی تو یورپ کا موسمِ سرما انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ امریکا بھی مخمصے کی حالت میں ہے اور صدر جوزف بائیڈن نے روس کے حوالے سے کوئی بھی بڑی کارروائی کرنے سے اب تک گریز کیا ہے۔ نیٹو کا سیٹ اپ بھی خاموش ہے۔ نیٹو نے یوکرین کو محفوظ رکھنے کے نام پر کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ روس کی مہم جوئی کے آگے امریکا اور یورپ نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں۔ امریکی قیادت یوکرین کی صورتِ حال میں الجھنے سے واضح طور پر گریز کر رہا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ معاملات کو صرف باتوں اور دعوؤں تک رکھا جائے۔

ایک زمانہ تھا کہ امریکا نے سابق سوویت یونین کو افغانستان کی صورتِ حال میں پھنسا کر اُس کے ٹکڑے کرا دیے۔ سوویت یونین تب بے حد کمزور ہو چکا تھا۔ افغانستان کی صورت میں ملنے والا جھٹکا اُس سے برداشت نہ ہو سکا۔ امریکا نے پاکستان کی آڑ لے کر سوویت یونین کو ناکوں چنے چبوائے۔ اب امریکا کمزور پڑ چکا ہے اور ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یوکرین کو بچانے کی کوشش میں اپنا بھی بہت کچھ جاتا رہے۔

دنیا بھر کے مبصرین یوکرین پر روس کے حملے کو ایک نئے دور کے آغاز کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔ عمومی تاثر یہ ہے کہ دنیا ایک بار پھر دو قطبی ہونے والی ہے۔ سوویت یونین کی تحلیل اور سرد جنگ کے خاتمے کے بعد کی صورتِ حال میں امریکا واحد سپر پاور کی حیثیت سے میدان میں رہ گیا تھا۔ یورپی یونین بھی طاقتور ہو کر ابھری مگر وہ چونکہ پورے یورپ کی ریاستوں کا مجموعہ تھی اس لیے اُسے واحد سپر پاور ریجن تو قرار دیا جا سکتا تھا، ملک نہیں۔ بہرکیف، یورپ نے امریکا کا ساتھ دیا اور دونوں نے مل کر تیس برس تک دنیا پر راج کیا۔ اس دوران سب کچھ امریکا کی مرضی کے مطابق ہوتا رہا۔ امریکی قیادت نے کمزور مسلم ریاستوں کو نشانے پر لیا اور انہیں برباد کر کے دم لیا۔ افغانستان جیسے تباہ حال ملک کو دہشت گردوں کی آماجگاہ قرار دے کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور اس خطے پر نظر رکھنے نیز چین کو دباؤ میں لینے کے لیے اپنی اور یورپ کی فوجیں وہاں تعینات کر دیں۔ کم و بیش بیس برس سے تک یہ تماشا چلتا رہا۔ امریکا کو افغانستان کی سرزمین سے کیا خطرہ ہو سکتا تھا؟ یہ تو بہانہ تھا۔ اصل مقصد خطے میں اپنی موجودگی یقینی بنانا تھا۔ یہ مقصد بخوبی حاصل کیا گیا۔ جب کام نکل گیا تو وہاں سے نکلنے میں بہتری سمجھی گئی۔

عراق، شام، لیبیا اور یمن کی بھی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ ایک طرف تو باقی دنیا کو یہ پیغام دینا تھا کہ کوئی امریکا اور یورپ سے ٹکرانے کا نہ سوچے اور دوسری طرف مسلمانوں سے سیکڑوں برس پہلے کی صلیبی جنگوں کی شکستوں کا بدلہ بھی لینا تھا۔ مغرب وسیع النظر اور روشن خیال دکھائی دینے کی بھرپور کوشش کرتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کی سوچ آج بھی بہت پست ہے۔ مسلمانوں کے معاملے میں مغرب اپنا بغض چھپانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسلام اور مسلمانوں کو کسی نہ کسی طور نشانے پر لیتے رہنے کی روش پر وہ آج بھی گامزن ہے۔

روس اور چین مل کر مغرب کے سامنے ڈٹے ہوئے ہیں۔ چین کی پوزیشن قابلِ رشک ہے۔ روس معاشی اعتبار سے اُس کی طرح مضبوط یا توانا تو نہیں مگر پھر بھی اُس کے پاس ایسا بہت کچھ ہے جس کی بنیاد پر وہ اکڑ سکتا ہے، اپنی بات منوانے کی بھرپور کوشش کر سکتا ہے۔ امریکا اور یورپ نے یوکرین کے بحران سے متعلق ردِعمل کے ذریعے ثابت کر دیا ہے کہ وہ جنوبی ایشیا، جنوبی امریکا اور افریقا کی کمزور مسلم و غیر مسلم ریاستوں ہی کو نشانے پر لے سکتے ہیں، کسی طاقتور ملک کا سامنا کرنے کی ہمت اُن میں اب نہیں رہی۔ خیر، یہ ہمت اُن میں تھی ہی کب! یوکرین پر روسی حملے کے حوالے سے امریکی صدر بائیڈن کا کہنا ہے کہ امریکا اس قضیے میں براہِ راست ملوث ہونے کے بجائے دفاعی انداز اختیار کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چین تو پھر چین ہے، امریکا اور یورپ میں اب روس کا سامنا کرنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ امریکا کو اس بات کا خوف لاحق ہے کہ کہیں وہ یوکرین کی دلدل میں نہ پھنس جائے۔

یوکرین پر روسی حملے کا حتمی نتیجہ چاہے کچھ بھی برآمد ہو، ایک بات تو طے ہے کہ..... کہ اب دنیا بدلنے والی ہے۔ اِس لمحے کا انتظار دنیا بھر کے کمزور چار پانچ دہائیوں سے کر رہے تھے۔ امریکا اور یورپ کو منہ دینے والی ریاستوں اور خطوں کے منظرِ عام پر آنے سے معاملات کی نوعیت بدلتی جا رہی ہے۔ یک قطبی دنیا کا زمانہ لد گیا۔ اب دنیا دو قطبی یا کثیر قطبی بھی ہو سکتی ہے۔ دنیا بھر کے وسائل کی نئی تقسیم بھی واقع ہو سکتی ہے۔ امریکا ہر معاملے میں اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ یورپ بھی بہت محتاط ہو کر چل رہا ہے۔ یورپ میں بہت سے معاملات پر مکمل اتفاقِ رائے نہیں پایا جاتا۔ سب کے اپنے اپنے مفادات ہیں۔ کوئی بھی ملک تمام معاملات میں سب کا ساتھ دینے پر آمادہ نہیں۔

بہرکیف، اس وقت دنیا اُس موڑ پر ہے جس کا صدیوں انتظار کیا جاتا ہے۔ ہم ایک سپر پاور کے زوال اور اُس کے ہم

نواؤں کے تذبذب کے شاہد ہیں اور ساتھ ہی چین و روس سمیت متعدد نئی قوتوں کو تیزی سے ابھرتے ہوئے بھی دیکھ رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دنیا ختم ہو رہی ہے اور دوسری، مختلف دنیا ابھر رہی ہے۔ اس نئی دنیا کے خدوخال حتمی طور پر کیا شکل اختیار کریں گے یہ تو آنے والا وقت بتائے گا اور وہ وقت بھی زیادہ دور نہیں۔

تیزی سے ابھرتی ہوئی دنیا میں کلیدی کردار مسلم دنیا کو ادا کرنا ہے۔ مسلم دنیا میں حقیقی تحرک پیدا ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ایک نئی دنیا کی تشکیل میں اپنا کردار تندہی، دیانت اور دل جمعی سے ادا کیا جائے۔ عام مسلم ذہن خوفزدہ ہے۔ یورپ نے امریکا کے ساتھ مل کر اسلاموفوبیا کے ذریعے مسلمانوں پر دباؤ بڑھایا ہوا ہے۔ اِس دباؤ سے چھٹکارا پانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا ناگزیر ہے۔ مسلم ممالک کو اپنی کمزوریوں کا احساس کرتے ہوئے متحد ہو کر چین اور روس کے ہاتھ مضبوط کرنے پر متوجہ ہونا چاہیے۔ مغرب کی غلامی نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ یہ وقت پارٹنرز بدلنے کا ہے۔ امریکا اور یورپ پر دباؤ ڈال کر ہم (مسلم دنیا) نئی دنیا یعنی نئے عالمی نظام میں اپنے لیے بہتر پوزیشن یقینی بنا سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت ہو سکتا ہے جب سب ایک پلیٹ فارم پر ہوں۔ آپس کے اختلافات بھلا کر طے کرنا ہے کہ امریکا اور یورپ کی غلامی برقرار رکھنی ہے یا پھر چین اور روس کے ہاتھ مضبوط کر کے اپنے لیے ایک نئی دنیا میں قابلِ رشک مقام پکّا کرنا ہے۔

روس نے یوکرین پر ہمہ گیر نوعیت کا حملہ کر کے امریکا اور یورپ کی مجموعی طاقت اور کیفیت بے نقاب کر دی ہے۔ امریکی صدر بائیڈن نے یوکرین پر روسی لشکر کشی کے بعد ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ روس نے اگر یوکرین سے ہٹ کر نیٹو کے کسی رکن ملک پر حملہ کیا تو اُسے منہ توڑ جواب دیا جائے گا۔ اِس ایک بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکا کو اپنے مفادات کے تحفظ کی کس حد تک فکر لاحق ہے۔ کمزور مسلم ممالک کو تو اُس نے دو عشروں کے دوران جی بھر کے پامال اور تاراج کیا مگر روس جیسی طاقت سامنے آئی تو دُبک کر کونا پکڑ لیا۔ باقی دنیا کے لیے اِس صورتِ حال میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ کثیر قطبی دنیا میں کوئی ایک قوت تمام معاملات پر حاوی نہ رہے گی۔ چین اور روس کے ساتھ ترکی بھی ہوگا اور ایران بھی۔ کل کو بنگلا دیش، سری لنکا، ملائیشیا اور انڈونیشیا وغیرہ بھی مل کر اِس طرف آ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ایشین بلاک معرضِ وجود میں آ سکتا ہے۔

●●●

سری لنکا کے بگڑتے حالات

ہندوستان کے لیے خطرے کی علامت ...؟

Lt. Gen. Syed Ata Hasnain

بھارت کو سری لنکا میں جاری حالات اور کشیدگی کا ہر پہلو سے بغور جائزہ لینا چاہیے۔ اگرچہ سری لنکا کی افواج اور سیکورٹی ادارے حالات کو بہتر طور پر قابو میں رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم، اگر سری لنکا میں حالات اسی طرح رہتے ہیں تو بعید نہیں کہ اس کے اثرات بھارت پر مرتب ہوں، اور اس کی سلامتی کے حوالے سے نئے خدشات پیدا ہو جائیں۔ میں چونکہ پون آپریشن کا حصہ تھا، اس لیے مجھے زمینی حقائق کا بخوبی اندازہ ہے۔ اس پوری صورتحال میں سری لنکا سے اپنی جذباتی وابستگی کی وجہ سے میں بہت زیادہ مضطرب ہوں۔ یہاں میں موجودہ صورتحال کا ایک اجمالی جائزہ پیش کر رہا ہوں:

اس وقت سری لنکا میں جو حالات ہیں وہ یکدم پیدا نہیں ہوئے بلکہ اس کا آغاز کئی سال پہلے ہو گیا تھا۔ مہندا راجا پاکسے کا خاندان دنیا کے طاقت ور ترین اور با اثر سیاسی خاندان میں شامل ہوتا ہے۔ اس خاندان کے بے شمار افراد سری لنکا کی حکومت میں شامل ہیں۔ اس جزیرہ نما ملک میں یہ خاندان برسوں سے قابض ہے۔ چین کے ساتھ اس کی تزویراتی شراکت اور تعلقات کی سری لنکا کو بہت مہنگی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ ہمبن ٹوٹا بندرگاہ اور راجہ پاکسا ایئرپورٹ سری لنکا نے چین سے دو بلین ڈالر قرض لے کر تعمیر کیے لیکن یہ دونوں منصوبے ناکام ثابت ہوئے۔ اس وقت سری لنکا کو آٹھ بلین ڈالر چین کو ادا کرنے ہیں۔ اس سے پہلے مالی مسائل کے پیش نظر سری لنکا نے ہمبن ٹوٹا بندرگاہ، چین کو ۹۹ سالہ لیز پر دے دی تھی۔

سری لنکا کے معاشی حالات اپریل ۲۰۱۹ء کو ہونے والے دہشت گردی کے واقعے سے خراب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ سری لنکا کی معیشت کا زیادہ تر انحصار سیاحت پر ہے، اس واقعے کے بعد اس میں ستر فیصد کمی ہوئی۔ کورونا وائرس کی وجہ سے اس کی کمزور معیشت مزید متاثر ہوئی اور پھر اس میں بہتری نہ آ سکی۔ اس طرح سری لنکا قرضوں کی ادائیگی نہ کر سکا اور مسلسل معاشی زوال کی جانب بڑھتا رہا۔ اس وقت راجا پاکسے کی حکومت پر شدید دباؤ ہے کہ وہ فوری استعفیٰ دے۔

سری لنکا غیر یقینی صورتحال، انتشار اور افراتفری کا شکار ہے۔ کچھ اس طرح کے حالات شام میں بھی پیش آئے تھے، جب معیشت اور انفرااسٹرکچر کی تباہی کے بعد بڑے پیمانے پر افراد نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ تاہم، یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طرح کے حالات اس وقت ہی پیدا ہوتے ہیں جب قوم لسانی، گروہی اور مذہبی تقسیم کا شکار ہو جائے اور یوں ملک داخلی انتشار کا شکار ہو کر خانہ جنگی کی جانب بڑھنے لگتا ہے اور پھر عالمی دہشت گرد تنظیمیں اس طرح کے حالات سے فائدہ اٹھا کر ان ممالک میں اپنی بنیادیں مضبوط کر لیتی ہیں.

یہ حقیقت ہے کہ ۲۱۰۹ء میں ہونے والی دہشت گردی کی کے پیچھے داعش کا ہاتھ تھا، انہیں جنوبی ہندوستان میں موجود دہشت گرد نیٹ ورک سے بھی ہر طرح کی مدد حاصل تھی۔ سری لنکا میں علیحدگی پسند تامل عسکریت پسندوں کے ساتھ ایک طویل عرصے جنگ رہی ہے۔ اگرچہ سری لنکا کی افواج نے دیگر حلیفوں کی مدد سے اس جنگ میں طویل جدوجہد کے بعد کامیابی سے فتح حاصل کر لی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک سیمینار میں، میں نے جنرل سرتھ سے پوچھا تھا کہ اگر سری لنکا کی حکومت نسلی منافرت اور علاقائیت جیسے بنیادی مسائل کو اس کی جڑوں سے ختم کرنے کی سنجیدہ کوشش کرتی تو ایسے حالات پیدا نہ ہوتے۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک کی سلامتی اور استحکام کا براہ راست تعلق اس کی معیشت سے ہوتا ہے۔ ہندوستان کی ۶۰ فیصد بحری تجارت سری لنکا کے راستے ہوتی ہے۔ موجودہ صورتحال کے اثرات سے ہندوستان بھی متاثر ہوگا۔ سری لنکا اس وقت جس بحران کا شکار ہے، اس میں سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل کا بہت بڑا دخل ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان کی ساحلوں پر نقل مکانی کر کے آنے والے مہاجرین بھی مسائل میں اضافے کا سبب ہیں۔ اگر جاری فسادات اور خراب معاشی صورتحال میں قابو پانے کی فوری کوشش نہ کی گئی تو، سری لنکا کے علیحدگی پسند نسلی گروہوں کا ہندوستان کے علاقائی گروہوں سے تعلق اور ماضی میں ہندوستانی افواج کے خلاف کارروائیوں کے تناظر میں، سری لنکا کے موجودہ حالات ہندوستان کے لیے بھی خطرہ کا باعث بن سکتے ہیں۔

(ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"How a meltdown in Sri Lanka can have serious implications for India's security".
("news18.com". May 11, 2022)

ہندتو کا ہندوستان اور مسلمان

سید سعادت اللہ حسینی

اشارات کے صفحات میں اب تک ہم نے ہندتو کے افکار کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ سیکولر سیاست کی ان کم زوریوں پر روشنی ڈالی جس نے اس تحریک کے فروغ میں مدد دی۔ خود مسلم سیاست کی کم زوریوں کا جائزہ لیا۔ مسلمانوں کی حیثیت و پوزیشن کو واضح کرتے ہوئے ان کے مطلوب رویے سے متعلق اپنا نقطہ نظر پیش کیا اور گزشتہ چھ ماہ سے مختلف موضوعات کے تحت ہم اپنے مطلوب بیانیے کو زیر بحث لا رہے ہیں۔ اب اس بحث کو مکمل کرتے ہوئے اس تحریک کی اور اس کے اثرات کی موجودہ عملی صورت حال اور اس کے پیدا کردہ چیلنجوں سے نبرد آزما ہونے کی تدابیر پر کچھ باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔

ہندتو کی تحریک کیا چاہتی ہے؟

اب تک جو بحث کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندتو کے علم بردار کسی مخصوص ایجابی ایجنڈے کی بنیاد پر متحد نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ایسا کوئی مشترکہ پروگرام یا ملک کی تعمیر و ترقی کا کوئی منفرد وژن نہیں ہے جو اس تحریک کی اصل بنیاد بن سکے۔ معاشی و ترقیاتی ایجنڈے کے نام پر جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں وہ یا تو کم و بیش وہی باتیں ہیں جو ملک کی دیگر سیاسی جماعتیں پیش کرتی ہیں یا ایسی باتیں ہیں جو ان کے قدیم لٹریچر میں تو موجود ہیں لیکن آج ان باتوں سے ان کا دُور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس وقت عملاً کوئی سیاسی گروہ، دین دیال اپادھیائے کے معاشی و ترقیاتی فلسفے اور سودیشی نظریات کے سب سے زیادہ خلاف ہے تو وہ یہی برسر اقتدار گروہ ہے۔

ہندو راشٹر کا کیا مطلب ہے؟ اس کا سیاسی وژن کیا ہے؟ وہ کیسے موجودہ ہندوستان سے مختلف ہوگا؟ اس کی پالیسیوں اور اس کے وژن کی انفرادیت کیا ہے؟ اس کے حوالے سے بہت سی متضاد باتیں ان کے مفکرین کے یہاں ملتی ہیں۔ جہاں گولوالکر جیسے قدیم مفکرین، ویدوں کی بنیاد پر ایک ریاست کا خواب دکھاتے ہیں وہیں سیشادری جیسے جدید اسکالر اسے ایک غیر سیاسی تصور مانتے ہیں جس کا ریاست سے تعلق نہیں ہے۔ ان وجوہ سے بعض مفکرین کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جس چیز کو وہ ہندو راشٹر کہتے ہیں وہ ایک نعرے اور چند سطحی جذباتی پالیسیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

یہ سیاست ساری کی ساری منفی ایجنڈے پر کھڑی ہے۔ اس کا سب سے اہم محرک حسد کا جذبہ ہے۔ اس حسد کے سرچشمے کئی ہیں۔ معاصر مسلم فرقے کی پرکشش تہذیبی قدریں اور سادہ اور اپیل کرنے والے عقائد، چار دانگ عالم میں اس کا پھیلاؤ اور عالمی حیثیت، نشاۃ ثانیہ کی طاقتور تحریکیں اور ان کی پائیدار ٹھوس بنیادیں، اور سب سے بڑھ کر اس کا تاریخی ورثہ، ان سب عوامل نے مل کر 'اجتماعی حسد' کی ایک منفرد کیفیت کو پروان چڑھایا ہے۔ سیاسی نظریہ ساز گڈ اوارتھی نے مشہور فرانسیسی مصنف والٹیر (Francois Voltaire 1694-1778) کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ آپ کسی ایسی چیز سے نفرت نہیں کر سکتے جس سے آپ دیوانہ وار محبت نہ کریں، بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''مسلمانیت یا مسلمان پن سے اگر کسی تنظیم کو 'محبت' ہے تو وہ کوئی سیکولر تنظیم نہیں بلکہ آر ایس ایس ہے۔ آر ایس ایس کے اکثر پروگرام، اسلام کے بارے میں ان کے ایک خاص مشاہدے (اور اس کے گہرے اثر) کو ظاہر کرتے ہیں۔ دیگر باتوں کے ساتھ آر ایس ایس کے نزدیک مسلمان ہونے کا مطلب، اتحاد (یا امت واحدہ) کا ایک گہرا احساس، ڈسپلن، باہم اخوت، اور ایک دوسرے کے لیے خلوص و محبت ہے۔ (مسلمان ہونے کا مطلب) ایک دوسرے کے لیے قربانی کا جذبہ اور اپنے فرقے (اور اصولوں) کے لیے ضرورت پڑنے پر جنگ کے لیے بھی تیار رہنے کی صلاحیت ہے۔ جدید دنیا میں یہ آئیڈیل ایک نہایت شاندار خواب کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ بدترین تشدد کا نشانہ بنے رہنے کے باوجود (آر ایس ایس کے تصور میں) مسلمان روحانی، اخلاقی اور جذباتی رجسٹر میں بہت بالاتر نظر آتے ہیں''۔

اجتماعی حسد کی اسی نفسیات نے نفرت، انتقام اور ایذا پسندی (Sadism) کی انتہائی شدید کیفیات کو جنم دیا ہے۔ حالاں کہ گزشتہ ستّر برسوں میں ہندوستانی مسلمان معاشی، سیاسی اور تعلیمی لحاظ سے اس قدر پیچھے ہو چکے ہیں کہ ان سے حسد کا بظاہر کوئی سبب باقی نہیں رہا۔ لیکن ان کا تاریخی اور تہذیبی ورثہ، غالباً ان عناصر کے اندر ابھی بھی عدم تحفظ کا اور کم تری کا احساس پیدا کرتا ہے۔ چناں چہ اسی ورثے کو بنیاد بنا کر پورے اکثریتی سماج میں خوف پیدا کرنے کی کوشش، اس تحریک کی اور اس کے بیانیوں کی آج سب سے نمایاں خصوصیت بن چکی ہے۔

ماہر سیاسیات راج شری چندرا نے فرقہ پرستانہ تشدد کی موجودہ لہر کی پشت پر تین اہم تصورات کی نشان دہی کی ہے۔ ایک اجتماعی نرگسیت (collective narcissism)، یعنی تاریخ کے حوالے سے خود کی برتری کا ایک واہمہ یا مصنوعی تصور یا نوسٹالجیا اور ایک شاندار ماضی کا تصور اور اس پر فخر کا جذبہ۔ ان کے مطابق نرگسیت پر مبنی یہ سرنگی تصور (tunnel vision) حالات و واقعات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہی دکھا پاتا ہے۔ ہم نے گزشتہ شمارے میں اس کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ دوسرے، شدید اجتماعی احساس مظلومیت (the collective sense of victimhood) یعنی یہ تصور کہ اس ملک کی اکثریت انتہائی مظلوم ہے۔ اس کے مذہبی مقامات، اس کے تہوار، جلسے جلوس، اس کی انا اور عزتِ نفس، اس کی تاریخ اور ورثہ، اس کی ڈیموگرافی، اس کے مفادات، سب کچھ ظلم و استحصال کے شکار ہیں۔ اور ایک پسماندہ کمزور اقلیت، اپنی 'سازشوں' کے ذریعے انہیں برسوں سے ظلم کا شکار بنائے ہوئے ہے اور آج بھی بنا رہی ہے۔ تیسرے، جذبہ انتقام (collective revenge) یعنی اس مصنوعی ظلم کا بدلہ لیا جانا چاہیے۔ تاریخ کا انتقام لینا چاہیے۔ منہ بھرائی کا انتقام لینا چاہیے۔ جو کچھ سہولتیں اقلیتوں کو دی جاتی رہی ہیں ان کا انتقام لیا جانا چاہیے۔ جو 'ترجیحی' پوزیشن انہیں حاصل ہے وہ چھینی جانی چاہیے۔ جو طاقت و قوت، جو مراعات، جو عالمی اثر و رسوخ اور جو تہذیبی کشش انہوں نے صدیوں سے انجوائے کی ہے، اس سے انہیں محروم ہونا چاہیے اور یہ چیزیں اب ہندوؤں کو حاصل ہونی چاہئیں۔

قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے منفی جذبات کی عمر ہمیشہ کم ہوتی ہے۔ تاریخ کے کسی مرحلے پر ایسے جذبات شدید ہیجانی کیفیات ضرور پیدا کرتے ہیں لیکن جب تک ان جذبات کی بنیاد کسی ٹھوس مذہبی یا نظریاتی تصور پر نہ ہو (جیسے صلیبیوں کے یہاں تھی) وہ مستقل تعلقات کی بنیاد نہیں بن سکتے۔

متوازن و درست مشاہدہ، موثر حکمت عملی کی پہلی ضرورت ہے!

اس تحریک اور اس کے پیدا کردہ خطرات کا مقابلہ کیسے ہو؟ اس سوال پر غور کرنے کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ حالات کا درست تجزیہ اور بالکل ٹھیک مشاہدہ (precise observation) ہو۔ چیلنجوں کے درمیان مشاہدے کی معمولی غلطی بھی آگے کے راستے کو کھوٹا کر دیتی ہے۔ جب تک حالات کا درست فہم نہ ہو اس وقت تک نہ مناسب حکمت عملی تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے اور نہ اس کے مؤثر نفاذ کا کوئی امکان

ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اس وقت عام طور پر ہمارے اہل فکر صورت حال کو اس کے تمام زاویوں سے دیکھ نہیں پا رہے ہیں۔ خوف، بے بسی اور ناامیدی کی نفسیات ایسی سرنگ میں پہنچا دیتی ہے جہاں سے منظر نامے کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہی دکھائی دیتا ہے اور اسی چھوٹے سے حصے پر اعصاب کا ارتکاز ہو جاتا ہے۔ میڈیا اور سوشل میڈیا کے شور وغوغا نے ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے کہ ہر خوف پیدا کرنے والا واقعہ اپنے حجم سے کئی گنا بڑھ کر دکھائی دینے لگا ہے۔ چنانچہ قتل و غارت گری اور فتنہ وفساد کا ہر واقعہ قتل عام (genocide) کی شروعات محسوس ہونے لگتا ہے۔ بل ڈوزر کی بے ہودہ سیاست، ملک گیر سطح پر مسلم آبادیوں کی تباہی کے وسیع منصوبے کی شروعات لگنے لگتی ہے۔ فرقہ پرستوں کی چھوٹی بڑی بزدلانہ شرانگیزیاں بیس کروڑ انسانوں کی وسیع آبادی کے اندر 'اسپین کی تاریخ' کے اعادے کا اندیشہ پیدا کر دیتی ہیں۔

یہ خوف، یہ شدت احساس اور یہ اجتماعی پیرانوئیا (collective paranoia) ہمارے حوصلوں کو پست کرتا ہے اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی امنگ میں مخل ہوتا ہے۔ اس وقت امت کی بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ ترقی کرے، تعلیم، معیشت اور سیاست کے میدانوں میں آگے بڑھے، اخلاقی وسماجی قوت حاصل کرے اور اپنی کم زوری وانفعالیت (vulnerability) دور کرے۔ احساس عدم تحفظ کی شدت یہ ہونے نہیں دیتی۔ یہ احساس کہ اب جان شدید خطرے کی زَد میں ہے، آدمی کے حواس کو مکمل طور پر اپنے تحفظ پر مرکوز کر دیتا ہے۔ وہ دوسری ساری فکریں چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم حالات کو حقیقی روپ میں دیکھیں۔ ویسے ہی دیکھیں جیسے کہ وہ ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔

سارے ہندتووادی یکساں نہیں ہیں!

ہندوتو کی تحریک نے جو جذبات پیدا کیے ہیں اس نے کئی طرح کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان میں وہ قدامت پسند مذہبی لوگ بھی ہیں جن کی مذہبی علامات سے گہری جذباتی وابستگی ہے اور مذہبی انا کا استحصال کر کے انہیں ساتھ لیا گیا ہے۔ وہ نسل پرست بھی ہیں جو مخصوص ذاتوں کی بالاتری اور روایتی ورن نظام کے احیا کا خواب دیکھتے ہیں۔ وہ قوم پرست بھی ہیں جو ساورکر اور گولوالکر کے تصورات اور ان کے قوم پرستانہ وژن سے متاثر ہیں۔ وہ انتہا پسند بھی ہیں جو بی جے پی اور آر ایس ایس کے انداز کار سے بھی مطمئن نہیں ہیں اور مزید جارح اور سخت موقف کے حامی ہیں۔ وہ مفاد پرست بھی ہیں جو اپنا یا اپنے گروہوں کا معاشی وسیاسی مفاد اِس میں دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں یا اقلیتوں کی پوزیشن کم زور ہو۔ بیرون ملک رہنے والے وہ ہندوستانی بھی ہیں جو عیسائیت، اسلام اور یہودیت کے منظّم مذہبی تصورات اور ان تصورات پر مبنی تحریکات سے مرعوب ہیں اور ہندوازم کا بھی ایسا ہی منظّم اور مشنری روپ چاہتے ہیں۔ وہ جرائم پیشہ عناصر بھی ہیں جن کی چھوٹی بڑی مجرمانہ ٹولیوں نے اس تحریک کو جائے پناہ بنالیا ہے۔ ایک تعداد اُن نسبتاً معتدل قوم پرستوں کی بھی ہے جو ہندوستان کی عالمی سطح پر ترقی دیکھنا چاہتے ہیں اور قدیم سیکولر جماعتوں کی موروثی یا بدعنوان سیاست کو اس راہ میں رکاوٹ سمجھتے ہیں۔ اس تحریک کی افرادی قوت میں ان سب قسموں کے افراد شامل ہیں۔ ان مختلف النوع عناصر کو جوڑنا اور انہیں ایک تحریک کا حصہ بنانا بلاشبہ ان کا تنظیمی کمال ہے۔ لیکن ایسا اتحاد پائیدار نہیں ہوسکتا اور دیر سویر اس کی فالٹ لائن نمایاں ہو کر ضرور انتشار پیدا کرے گی۔ ہم لوگ جب انہیں دیکھتے ہیں تو ایک مکمل طور پر ہم خیال، ہم آہنگ اور انتہائی منظّم گروہ کے روپ میں دیکھتے ہیں۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ان مختلف قسم کے افراد کے مفادات اور نظریات میں بھی کافی تنوع پایا جاتا ہے اور منفی جذبات کی شدت کے اعتبار سے بھی ان کی کئی سطحیں ہیں۔ مسلمانوں سے شدید نفرت رکھنے والے جنونی عناصر بھی ہیں اور قدرے معتدل مزاج لوگ بھی ہیں۔ جب ہم صورت حال کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں تو اس حقیقت کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اس کا لحاظ نہ ہو تو ہمارے تجزیے غلط ہو جاتے ہیں اور غلط تجزیے غلط اور ضرر رساں اقدامات کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ہندوستان کے عوام پر اس تحریک کا اثر اب بھی محدود ہے!

ہمارے بعض تجزیہ نگار بی جے پی کی مسلسل انتخابی کامیابیوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ہندوستان کے کم وبیش تمام غیر مسلم یا تمام ہندو، فرقہ پرست ایجنڈے کے مؤید اور اس کے ہم نوا ہیں۔ یہ بھی بالکل خلاف واقعہ نتیجہ ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ یہ بی جے پی کے سب سے زیادہ عروج کا دور ہے۔ لیکن اس دور میں بھی ملک میں بی جے پی کے ووٹروں کی تعداد ۳۸ فیصد سے کم ہے۔ پرشانت کشور کے تجزیے کے مطابق بی جے پی کے ووٹوں کا شمار کنندہ (denominator) چالیس فیصد ہے۔ شمار کنندہ (denominator) کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جو بی جے پی کو ووٹ دے سکتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ چالیس فیصد ہیں۔ انہیں جو بھی ووٹ ملے گا وہ اسی چالیس فیصد میں سے ملے گا۔ یعنی کم سے کم آدھے ہندو آج بھی بی جے پی کو ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس بات کی تائید متعدد سروے رپورٹوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً پیو ریسرچ فاونڈیشن کی رپورٹ (جس کی کچھ اور تفصیل آگے آرہی ہے) میں کہا گیا ہے کہ ہندو ووٹروں کی ۴۹ فیصد تعداد نے ۲۰۱۹ء میں بی جے پی کو ووٹ دیا تھا۔ ایک اور سروے، سی ایس ڈی ایس، لوک نیتی، دی ہندو کے سروے میں بی جے پی کو ووٹ دینے والے ہندوؤں کا تخمینہ ۴۴ فیصد کیا گیا ہے۔

پھر جو لوگ ووٹ دیتے ہیں، وہ بھی صرف مسلم دشمنی میں یا بی جے پی کے فرقہ پرست ایجنڈے ہی کی وجہ سے ووٹ نہیں دیتے۔ ووٹ دینے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے انتخابی نظام میں ووٹروں کی ایک بڑی تعداد، کسی پارٹی کی پالیسیوں سے متفق نہ ہونے کے باوجود انہیں ووٹ دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ مسلمان بھی مختلف پارٹیوں سے بے شمار اختلافات کے باجود مختلف وجوہ سے انہیں ووٹ دیتے ہیں۔ ایسا ہی دوسرے ووٹروں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

ہمارے یہاں سماج کے سنجیدہ مطالعے، سروے اور لوگوں کی سوچ اور رویوں سے متعلق ٹھوس اعداد وشمار مفقود ہیں، جس کی وجہ سے محدود مشاہدات اور کمزور بنیادوں پر قیاس آرائیاں ہی ہمارے تجزیوں کی بنیاد بنتی ہیں۔ ہمارے مذکورہ بالا احساسات بھی اگرچہ عام مشاہدے ہی کی بنیاد پر ہیں لیکن متعدد سروے رپورٹوں سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ اس وقت ہمارے پیش نظر دو اہم سروے ہیں۔ ایک وہ بڑا کل ہند سطح کا تازہ سروے ہے جو امریکا کے مشہور تھنک ٹینک ''پیو ریسرچ فاؤنڈیشن'' (واشنگٹن ڈی سی) نے کرایا تھا اور جس کی رپورٹ گزشتہ سال (جون ۲۰۲۱ء میں) ''ہندوستان میں مذہب: رواداری اور تفریق'' (Religion in India: Tolerance and Segregation) کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ۲۳۴ صفحات کی اس رپورٹ میں ہندوستانی عوام کی سوچ، مزاج اور رویوں کے بارے میں بڑی اہم معلومات اور اعداد وشمار ملتے ہیں۔ سنجیدہ تجزیہ نگاروں اور اہل علم نے عام طور پر اس رپورٹ کو بڑی اہمیت دی ہے۔ پیو ریسرچ سینٹر ایک امریکی ادارہ ہے۔ اس کا امکان کم ہے کہ ہندوستان کے معاملات میں اس کے سروے میں کسی قسم کی عصبیت یا سرکاری دباؤ حائل ہو۔ دوسرا سروے وہ ہے جو عظیم پریم جی یونیورسٹی کے سینٹر فار ریجنل پالیٹیکل اکنامی نے سی ایس ڈی ایس اور لوک نیتی کے تعاون سے کرایا اور جس کی ڈھائی سو صفحات کی رپورٹ 'انتخابات کے دوران سماج اور سیاست'

(Politics and Society Between Elections 2019)
کے عنوان سے شائع ہوئی۔

پیو کے سروے کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے اس کے محققین لکھتے ہیں

''ہندوستانی، مذہبی رواداری کے سلسلے میں جوش وخروش کا بھی اظہار کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے مذہبی فرقوں کو (دوسرے فرقوں سے) الگ تھلگ بھی رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ دو جذبات باہم متضاد محسوس ہوتے ہیں۔لیکن ہندوستانیوں کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔''

اس سروے کے مطابق ۸۵ فیصد ہندو یہ محسوس کرتے ہیں کہ تمام مذاہب کا احترام کرنا انتہائی ضروری ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہندوستانی عوام کی عظیم اکثریت آج بھی نفرت کے جنون کی شکار نہیں ہے۔اس رپورٹ میں مذہبی تفریق کو سمجھنے کے لیے ایک اشاریہ 'مذہبی تفریق کا اشاریہ' (index of religious segregation) تشکیل دیا گیا ہے۔ اس اشاریہ میں زیادہ سے زیادہ اسکور ۶ ہے جس کا مطلب زیادہ سے زیادہ تفریق میں یقین ہے۔سروے کے اعداد وشمار کے مطابق ملک میں ۱۳ رفیصد ہندوؤں کا اسکور ۶ ہے۔ (مسلمانوں میں یہ تناسب تھوڑا سا کم یعنی ۱۲ رفیصد ہے) جب کہ ۴۳ فیصد ہندو ایک سے تین کا اسکور رکھتے ہیں۔یعنی مذہبی تفریق میں یقین نہیں رکھتے۔ رپورٹ میں بہت سے حساس سوالات کے حوالے سے لوگوں کی سوچ کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔مثلاً شرعی عدالتوں اور دارالقضا کا نظام فرقہ پرستوں کو بہت زیادہ کھٹکتا ہے۔لیکن اس سروے میں تیس فیصد ہندوؤں نے مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنے عائلی معاملات کے تصفیے کے لیے شرعی عدالتیں قائم کریں اور ان سے رجوع کریں۔

کم وبیش یہی نتائج عظیم پریم جی یونیورسٹی کی رپورٹ سے بھی نکلتے ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق شدت پسند قوم پرستوں کا تناسب ملک میں تقریباً ایک تہائی ہے جب کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں یہ تناسب ۴۵ فی صد ہے۔ جو لوگ مسلمانوں کو وطن مخالف (unpatriotic) سمجھتے ہیں ان کی تعداد ہندوؤں میں ایک تہائی ہے۔ ان میں ۱۲ رفیصد بہت زیادہ وطن مخالف سمجھتے ہیں اور باقی لوگ، تھوڑے بہت وطن مخالف سمجھتے ہیں۔مسلمانوں کو انتہائی امن مخالف اور متشدد (extremely violent) سمجھنے والوں کا تناسب ہندوؤں میں ۱۱ فیصد ہے۔ مذہب تبدیل کرانے والوں کو سزا دلانے کے چالیس فیصد لوگ مخالف ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں یہ تناسب ۳۵ فیصد ہے جب کہ دیگر ہندو طبقات میں یہ تناسب ۴۰ سے بھی زیادہ ہے۔

پیو فاؤنڈیشن کے سروے سے متعدد سنجیدہ تجزیہ نگاروں کی اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ بی جے پی کے ووٹروں کی قابل لحاظ تعداد بی جے پی کے فرقہ پرست ایجنڈے سے اتفاق نہیں رکھتی۔ بی جے پی کو ووٹ دینے والے ووٹروں کی محض نصف تعداد ہی یہ سمجھتی ہے کہ سچے ہندوستانی ہونے کے لیے ہندو ہونا نہایت ضروری ہے۔ بی جے پی کی تائید کرنے والوں میں ۷۰ فیصد ہندو مذہبی تنوع کو ہندوستان کے لیے مفید سمجھتے ہیں۔ پیو کی ٹیم نے ہندتو کے وفادار پیروؤں کی تین خصوصیات نوٹ کی ہیں۔ وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچے ہندوستانی ہونے کے لیے ہندو ہونا اور ہندی بولنا ضروری ہے اور جنھوں نے بی جے پی کو ووٹ دیا ہے۔سروے کے مطابق ہندو عوام میں ایسے لوگوں کا تناسب ۳۰ فیصد ہے۔وسطی ہندوستان (اتر پردیش، اتراکھنڈ، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ) میں یہ تناسب سب سے زیادہ یعنی ۵۳ فی صد ہے، مشرق (بہار، جھارکھنڈ اور بنگال) میں ۲۸ فیصد، مغرب (مہاراشٹر و گجرات) میں ۲۶ فیصد ہے جب کہ جنوب (تلنگانہ، کرناٹک، اے پی، تمل ناڈو، کیرلہ) میں محض پانچ فیصد ہے۔ اوپر جس مذہبی تفریق کے اشاریے کا ذکر کیا گیا ہے، اس کے حوالے سے بی جے پی کو ووٹ دینے والوں کے بھی ۲۶ فیصد حصہ کا اسکور صفر ہے یعنی وہ بالکل مذہبی تفریق میں یقین نہیں رکھتے۔

ان سروے رپورٹوں کے نتائج سے مکمل طور پر اتفاق ضروری نہیں ہے۔ گزشتہ ایک سال میں صورت حال میں تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، یہ بات بھی سچ ہے۔لیکن ان سے یہ بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ اردو اخبارات، اردو سوشل میڈیا اور ہمارے مقررین وواعظین صورت حال کو جس انتہا پر جا کر دیکھتے اور دکھاتے ہیں وہ درست نہیں ہے۔

اس تجزیے سے ہمارے اس مشاہدے کی تائید ہوتی ہے کہ ہمارے ملک میں چار طرح کے لوگ ہیں۔ ایک چھوٹی تعداد اُن شدت پسند فرقہ پرستوں کی ہے جنھیں نفرت، حسد اور غیظ وغضب کی شراب پلا کر اندھا کر دیا گیا ہے۔ جو مسلمانوں کے بارے میں نہایت شدید نقطہ نظر رکھتے ہیں اور مختلف حساس موضوعات پر انتہا پسندانہ فرقہ پرست نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ مذکورہ سروے رپورٹوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تعداد ہندو سوسائٹی میں چھ سے دس فیصد کے درمیان ہے۔ ہندی بولنے والے علاقوں میں یہ تناسب زیادہ ہے۔ اس کے بعد مشرقی ریاستوں میں، پھر مغربی ریاستوں میں، پھر شمال مشرق میں اور سب سے کم جنوبی ہندوستان میں ہے۔

دوسری ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو غلط فہمیوں کے شکار ہو رہے ہیں۔ پہلے گروہ کے نفرت کے ایجنڈے کو دھیرے دھیرے سبسکرائب کر رہے ہیں۔ جتنا ہم غافل رہیں گے ان لوگوں کی تعداد بڑھتی رہے گی اور ہماری مشکلات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ مذکورہ سروے رپورٹوں کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندو آبادی میں یہ تناسب تقریباً بیس سے تیس فیصد ہے۔اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔اس اضافے کو روکنا ہی اس وقت ہماری اسٹریٹجی کا سب سے اہم پہلو ہونا چاہیے۔

تیسرے ایک بڑی اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ملک میں امن وامان چاہتے ہیں۔مسلمانوں کے بارے میں کوئی شدید منفی رجحان نہیں رکھتے۔ان کے حقوق کی بھی تائید کرتے ہیں۔لیکن خاموش ہیں۔ظلم اور نفرت کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ وہمت نہیں پاتے۔ان کی ایک تعداد مختلف وجوہ سے بی جے پی کو ووٹ بھی دیتی ہے۔ ہندو آبادی میں ان افراد کا تناسب پچاس تا ساٹھ فیصد ہے۔ یہ تناسب کرناٹک کے سوا جنوبی ہند کی باقی ریاستوں میں بہت زیادہ ہے اور شمالی ووسطی ہند میں کم ہے۔

باقی پانچ تا دس فیصد لوگ وہ ہیں جو پوری جرأت کے ساتھ نفرت اور تفریق کے خلاف لڑ رہے ہیں۔مسلمانوں سے زیادہ، مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کر رہے ہیں۔ان میں مختلف نظریاتی گروہوں کے افراد بھی ہیں، سماجی تحریکوں سے منسلک جہد کار بھی ہیں، ادیب، صحافی و دانش ور بھی ہیں، وکلاء، طلبہ اور اساتذہ بھی ہیں اور عام لوگوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ یہ لوگ ملک میں ہر جگہ ہیں، یعنی معمولی فرق کے ساتھ شمال، جنوب، وسط ہند، مشرق، شمال مشرق، اور مغرب تمام علاقوں میں ان کا وجود ہے۔

نفرت کا سرچشمہ بھی اصلاً میڈیا ہے اور حالات کی مبالغہ آمیز تصویر کا بھی!

ملک میں مسموم فضا پیدا کرنے کے لیے شاطر فرقہ پرست طاقتیں دو اہم ذرائع کو بڑی کامیابی سے استعمال کر رہی ہیں۔ ایک تو میڈیا اور سوشل میڈیا اور دوسرے سیاست دان۔ میڈیا اور سوشل میڈیا میں نفرت، تفریق، خدشات اور انتہا پسند افکار جس شدت سے نظر آتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ ملک کی حقیقی زندگی میں وہ شدت موجود نہیں ہے۔ میڈیا کے ذریعے نفرت بھی پھیلائی جا رہی ہے اور اس نفرت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کے خوفناک پہلو کو بڑھا چڑھا کر دکھایا بھی

جارہا ہے۔میڈیا کے اس مبالغے کا اثر مسلمانوں کے میڈیا اور سوشل میڈیا پر بھی پڑتا ہے۔

یہ ایک طرح کی نفسیاتی جنگ (psychological war) ہے۔خوف پیدا کرنے والے واقعات کا مسلسل پروپیگنڈہ، مستقبل کی انتہائی بھیانک منظر کشی، ہندتو کے علم برداروں کو انتہائی منظّم، انتہائی طاقتور، بے پناہ عملی و ذہنی صلاحیتوں سے آراستہ اور غیر معمولی قوت واثر کا حامل دکھانا، مسلمانوں، ان کی قیادتوں اور ان کے اداروں کو حد سے زیادہ بے بس و لاچار، کم فہم و بے عقل بلکہ کرپٹ و بے ایمان باور کرانا اور ان سب کے ذریعے مسلمانوں کے حوصلے اتنے پست کر دینا کہ وہ مستقبل کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہ سکیں، یہ سب اس نفسیاتی جنگ کے مقاصد ہیں۔بعض نادان مسلمان بھی اس جنگ میں دانستہ یا نادانستہ آلہ کار بن جاتے ہیں۔

پریم جی یونیورسٹی کے محولہ بالا سروے کے بعض اعداد و شمار سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سخت گیر قوم پرستی اور اکثریت پرستی ہمارے ملک میں اصلاً میڈیا کے ذریعے تخلیق کردہ ایک مصنوعی صورت حال ہے۔جو لوگ میڈیا کا جتنا زیادہ ایکسپوژر رکھتے ہیں وہ اتنے ہی زیادہ سخت گیر قوم پرست ہیں۔درج ذیل چارٹ ملاحظہ فرمائیے۔اس چارٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے میڈیا اور سوشل میڈیا کا ایکسپوژر بڑھتا جاتا ہے، انتہا پسندی بھی بڑھتی جاتی ہے۔فیس بک اور ٹوئٹر سے جڑی نوجوان نسل میں انتہا پسندانہ افکار کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اُن کے مشاہدات و جذبات کی تشکیل میں حقیقی زندگی سے متعلق ٹھوس حقائق کا رول کم اور سائبرستان کی مصنوعی 'حقیقتوں' (virtual relalities) کا رول زیادہ ہوتا ہے۔

بڑی آزمائشیں درپیش ہوسکتی ہیں لیکن آزمائشوں ہی سے یہ امت قوت پائے گی

حالات جس رخ پر جارہے ہیں، اس سے یہ اندیشے تو یقیناً ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات بڑھیں گی۔یہ بھی عین ممکن ہے کہ ان کو بڑی آزمائشیں درپیش ہوں۔اندیشہ ہے کہ کچھ علاقے پھر خوں ریز فسادات کی زد میں آئیں، کچھ لوگوں کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں، مسلمانوں کے اداروں اور ان کی اجتماعی ہیئتوں کو تاراج کرنے کی کوششیں ہوں، تعلیم اور معیشت میں ان کی ترقی کی رفتار کو بریک لگانے کی سازشیں ہوں۔ان کے تہذیبی و مذہبی تشخص اور ان کی عبادت گاہوں کے لیے خطرات بڑھا دیے جائیں۔

یہ سب اندیشے درست ہیں لیکن یہ بات سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ سب نئی باتیں نہیں ہیں۔اس ملک کے مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء کا غدر دیکھا ہے، جس میں انگریزوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے غیظ وغضب کی پوری قوت صرف کردی تھی اور دلی سے کلکتہ تک درختوں پر مسلمانوں کی نعشیں لٹکی ہوئی نظر آتی تھیں۔مسلمان ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے موقع پر انتہائی دردناک قتل عام سے گزرے ہیں۔حیدرآباد کے پولیس ایکشن جیسے متعدد بڑے علاقائی سانحوں کا سامنا کیا ہے۔فسادات کے پیہم سلسلوں کے شکار بنتے رہے ہیں۔ہر زمانے میں مختلف عنوانات سے پولیس اور انتظامیہ کی زیادتیوں کے نشانے پر رہے ہیں۔فرقہ پرست قوتیں آزادی کے بعد ہی سے سرگرم ہیں اور مسلمان ہر زمانے میں ان کے چیلنجوں کا سامنا کرتے رہے ہیں۔

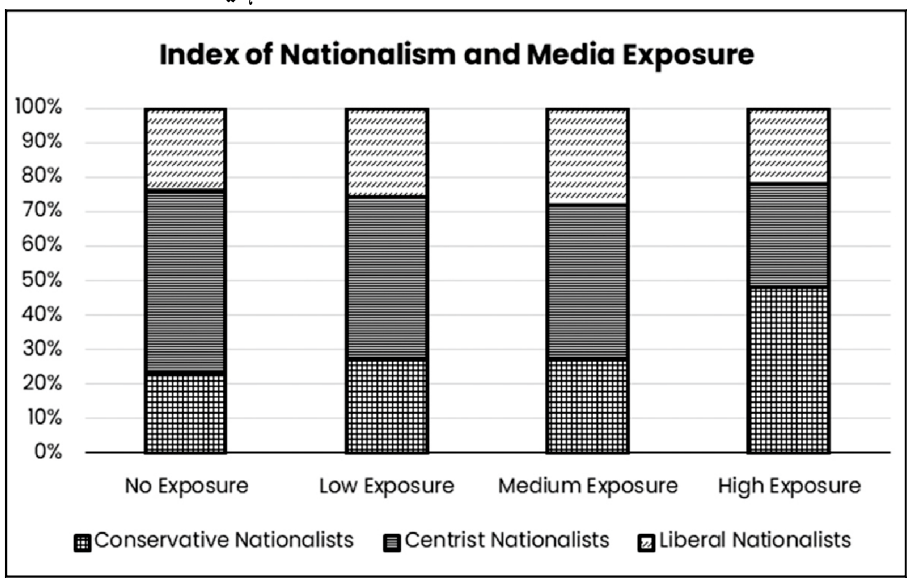

یہ حالات نئے نہیں ہیں۔لیکن ان حالات کی بنیاد پر جو شدتِ احساس اور خوف و مایوسی کی جو فضا پیدا کی جارہی ہے، وہ ایک نئی صورت حال ہے اور تشویش ناک ہے۔اس امت کے دشمنوں کی فہرست تیار کی جائے تو اس وقت جو سب سے بڑا دشمن ہے وہ، ڈر، خوف یا مایوسی کی نفسیات ہے۔کسی قوم کے لیے سب سے بڑی تباہی مایوسی و ناامیدی ہے۔سخت حالات کی عمر مختصر ہوتی ہے لیکن اگر پست ہمتی اور خوف کی نفسیات عام ہوجائے تو اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔یہ نفسیات زندگی کی امنگ چھین لیتی ہے۔خود اعتمادی کو مجروح کردیتی ہے۔آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے حوصلوں کو ختم کردیتی ہے۔اگر امید کی لو روشن رہے تو بڑی سے بڑی ناکامی اور بھیانک سے بھیانک سانحہ بھی قوموں کی کمر نہیں توڑ سکتا۔وہ اپنی خاکستر میں امید کی چنگاریوں کو چھپائے رکھتے ہیں اور مناسب وقت پر مثبت تبدیلی کا ایک ہلکا سا جھونکا بھی ان چنگاریوں کو بھڑکا کر شعلہ بنا دیتا ہے۔اس کے برخلاف اگر امید و یقین کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو سائے اور واہمے بھی دہشت طاری کرنے لگتے ہیں۔ہوا کے جھونکے سے بھی تباہ کن آندھی کا احساس ہوتا ہے۔ایسی بزدل قوموں کو مارنے کے لیے کسی دشمن کی ضرورت نہیں پڑتی۔اندیشوں اور واہموں کی شکار ہوکر وہ اپنی موت آپ مرجاتی ہیں۔

ڈر اور خوف ایمان کی ضد ہے۔اللہ پر ایمان رکھنے والا نہ کبھی خوف کا شکار ہوسکتا ہے اور نہ مایوسی کا۔خوف شیطان کا ہتھکنڈہ ہے۔

ترجمہ: ''وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔لہٰذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔جو لوگ آج کفر کی راہ میں دوڑ دھوپ کررہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمھیں آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے''۔(آل عمران:۱۷۵)

یہ یقین عام کرنے کی ضرورت ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت بیس کروڑ مسلمانوں کو ختم نہیں کرسکتی

ان حالات کی عمر بھی ان شاء اللہ زیادہ طویل نہیں ہوگی۔یہ دور گزرے گا۔کوششوں کا ہدف یہ ہونا چاہیے کہ ان حالات سے ہم زیادہ طاقتور اور زیادہ موثر ہوکر نکلیں اور ہمارے ملک میں بھی حالات کے یہ تھپیڑے زیادہ بہتر فضا اور موثر اصلاحات کی راہیں ہم وار کریں۔ان حالات کو فیڈ بیک کی حیثیت سے لینے کی ضرورت ہے۔ان مشکلات کا اصل مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے احتساب کی طرف مائل ہوں۔اُن کمزوریوں اور غلطیوں کا ادراک کریں جو اپنی تاریخ میں ہم مسلسل دہراتے رہے ہیں اور آج بھی دہرا رہے ہیں۔

اپنے رویوں کو بدلیں۔ زیادہ قوت اور بہتر حکمت عملی کے ساتھ صحیح سمت میں جدو جہد کے لیے آگے بڑھیں۔ سخت حالات بعض قوموں کو کم زور کردیتے ہیں اور انہی جیسے حالات سے بعض قومیں زیادہ طاقتور اور زیادہ بااثر بن کر نکلتی ہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے حوصلے باقی رہیں، خوداعتمادی باقی رہے اور ساتھ ہی جائزہ واحتساب کی اور خود کو بہتر رخ پر بدلنے کی اسپرٹ پروان چڑھے۔ ہمارے اہل فکر اور قیادتوں کی بنیادی ذمے داری انہی جذبات کو پروان چڑھانا ہے نہ کہ مبالغہ آمیز خوف اور مایوسی پیدا کرنا۔

حکمت عملی کا اہم ترین جز، اپنے اصولوں پر استقامت

ان حالات میں اسلام دشمن طاقتوں کو روکنے کا سب سے اہم طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے اصولوں پر پوری استقامت کے ساتھ جم جائیں۔ ایک خدا کی بندگی، اس کے احکام کی پابندی، زندگی کے ہر معاملے میں قرآن اور اسوہ رسول کی پیروی، حق کی دعوت اور اس کے لیے جدوجہد، یہ ہمارے اٹل اصول ہیں۔ ہماری شناخت کچھ نعروں سے یا خاص قسم کے ملبوسات سے نہیں بلکہ اصلاً ان اصولوں سے وابستہ ہے۔ رنگ نسل، ذات وفرقہ کے تعصّبات سے اوپر اٹھ کر ہر ایک کے لیے عدل وقسط، ہر قسم کے ظلم کا مقابلہ وغیرہ، یہ بھی ہمارے اٹل اصول ہیں۔ مزاحمت کی اصل شکل یہ ہے کہ ان اصولوں پر ہم غیر معمولی استقامت کا مظاہرہ کریں۔ اہل حق جب مشکل سے مشکل حالات میں حق پر ڈٹ جاتے ہیں تو اسی سے حق کا حق ہونا واضح ہوتا ہے۔ وہ جب ہر طرح کی مصیبت برداشت کرکے بھی اپنے اصول نہیں چھوڑتے تو سب لوگ ان اصولوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ بھی مشکل حالات کا ایک اہم مقصد ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ حق کا حق ہونا واضح کردیتا ہے۔

اٹل اصولوں پر استقامت کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ غیر اہم باتوں کے لیے ہمارے اندر لچک ہو۔ اسلام کے ابدی اصولوں پر پوری قوت سے قدم جما دینا اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب ہم اپنی اُن عادتوں اور رواجوں کو جن کی حیثیت زیادہ سے زیادہ مقامی تہذیبی مظاہر کی ہے، اصولوں کی حیثیت دینا چھوڑ دیں۔ کیا چیز چھوڑی جاسکتی ہے اور کیا نہیں چھوڑی جاسکتی، کون سی باتیں اٹل اصولوں کا درجہ رکھتی ہیں اور کون سی محض اجتماعی پسند کی، اس فرق کا لحاظ ضروری ہے۔

اگر کہیں ظلم ہوتا ہے، جان ومال پر حملے ہوتے ہیں تو اپنے دفاع کی ہر ممکن کوشش ضرور کریں۔ اسلام اس کا حکم دیتا ہے اور ملک کا قانون وآئین اس کو یعنی اپنے دفاع کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ ہم پوری بہادری سے، موت سے ڈرے بغیر خود کو، اپنے بھائیوں کو اور اپنی بستیوں کو بچانے کی کوشش کریں۔ ہر مظلوم کی حفاظت کریں چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقے سے ہو۔ ظلم کے خلاف آواز بھی بلند کریں۔ مظلوموں کے حق کے لیے قانونی جدوجہد بھی کریں۔ لیکن ان کاموں کو سب کچھ نہ سمجھیں۔ یہ ردعمل درست ہونے کے باوجود محض فوری درپیش مسائل کا عارضی ردعمل ہے۔ اس پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ ضروری (necessary) ہے لیکن کافی (sufficient) نہیں۔

حکمت عملی کا دوسرا جز، زیادہ سے زیادہ انگیج منٹ

اوپر ہم نے ملک کی آبادی کو چار گروہوں میں تقسیم کیا تھا۔ اس وقت اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ چوتھا گروپ یعنی وہ لوگ جو فرقہ پرستی کے خلاف پوری جرأت سے کھڑے ہوئے ہیں، مضبوط ہوں۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ اس گروہ کی ہر ممکن مدد ہو۔ اس کی تعداد بڑھے۔ تیسرا گروہ، یعنی وہ بڑی اکثریت جو فرقہ پرستی کو پسند نہیں کرتی لیکن خاموش ہے، اس کے ضمیر کو بیدار کیا جائے اور ملک میں امن وامان کے قیام کے لیے اسے آمادہ کیا جائے۔ دوسرا گروہ جو نفرت کے ایجنڈے کا شکار ہورہا ہے، اُسے شکار ہونے سے روکا جائے اور پہلا گروہ جو سب کچھ جان بوجھ کر، فتنہ وفساد کے راستے پر گامزن ہے اسے الگ تھلگ کیا جائے۔

اس کام کا طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ انگیجمنٹ ہو۔ ملک میں فرقہ پرستی کے فروغ کا بڑا سبب فرقوں کے درمیان تفریق ہے۔ یہ تفریق دو طرح کی ہے۔ ایک تو وہ تفریق ہے جسے سماجی نفسیات کی زبان میں رویہ کی تفریق (attitude polarisation) کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو گروہوں میں اختلاف شروع ہوتا ہے، پھر ہر گروہ کا اختلافی نقطہ نظر دوسرے گروہ کے ردعمل میں شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ متضاد خیالات میں شدت کے اعتبار سے دونوں، اس کیفیت پر پہنچ جاتے ہیں کہ ہر ایک ہر واقعے کو اپنی سوچ کے اعتبار سے معنی پہنانا (theorise) شروع کرتا ہے۔ ایک ہی جگہ ایک ہی واقعہ ایک گروہ کو ایک روپ میں دکھائی دیتا ہے اور دوسرے گروہ کو بالکل مخالف روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ حالیہ کئی واقعات میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ بل ڈوزر کے واقعات کو مسلمانوں نے، مسلم آبادیوں کو تاراج کرنے کی ایک بڑی سازش کے روپ میں دیکھا تو غیر مسلموں کی ایک بڑی آبادی نے اسے فسادیوں کو سزا دلانے کی ایک موثر تدبیر سمجھا۔ رام نومی کے واقعات پر مسلمانوں کا تاثر یہ تھا کہ یہ بڑے پیمانے پر فسادات برپا کرنے کی منظّم سازش تھی جب کہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد کے نزدیک یہ مذہبی جلوسوں پر پتھراؤ کی ملک گیر منظّم مہم تھی۔ سوچ کی تفریق جب پیدا ہوجاتی ہے تو ٹھوس شواہد کی بھی اپنے اپنے نقطہ نظر سے تاویل ہونے لگتی ہے۔ اور دونوں گروہوں کے درمیان بامعنی ڈائیلاگ ناممکن ہونے لگتا ہے۔

دوسری بڑی تفریق وہ ہے جسے سماجی تفریق (social polarisation) یا مکانی تفریق (spatial polarisation) کہا جاتا ہے۔ یعنی رہن سہن کے لحاظ سے، میل جول کے لحاظ سے، دوستی وقربت کے لحاظ سے ایسی دوری جس کے نتیجے میں بات چیت اور تبادلہ خیال مشکل سے مشکل تر اور کم سے کم تر ہوتا چلا جائے۔ سروے رپورٹیں اس حوالے سے بہت تشویشناک صورت حال پیش کرتی ہیں۔

اوپر جن دو سروے رپورٹوں کا ہم نے حوالہ دیا ہے، اُس کے بعض نتائج چونکانے والے بھی ہیں اور ہمیں سنجیدہ غور اور عمل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری بڑھ رہی ہے۔ اور ساتھ رہنے، ملنے جلنے اور بات چیت کے مواقع کم ہورہے ہیں۔ ۳۶ فی صد ہندو کسی مسلمان کو اپنے پڑوسی کی حیثیت سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کسی ہندو کو پڑوسی کی حیثیت سے قبول نہ کرنے والے مسلمانوں کا تناسب ۱۶ فی صد ہے۔) ۴۷ فی صد ہندوؤں اور ۴۵ فی صد مسلمانوں کے دوست صرف اپنے ہم مذہب لوگوں تک محدود ہیں۔ اُن ہندوؤں کا تناسب جو اسلام کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہیں محض ۳۶ فیصد ہے۔ (سکھوں، بدھوں اور جینیوں میں یہ تعداد اور بھی بہت کم ہے)۔

سماجی تفریق لازماً نفرت کا نتیجہ نہیں ہوتی لیکن نفرت کے فروغ کی زمین ضرور فراہم کرتی ہے۔ خاص طور پر رویے کی تفریق (attitude polarisation) دھیرے دھیرے نفرت کو پروان چڑھاتی ہے۔ مذکورہ سروے رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے لوگوں میں نفرت کا عنصر ہے اس سے کہیں زیادہ لوگوں میں تفریق کا ذہن ہے۔ یہ لوگ آئندہ آسانی سے نفرت والے خیمے میں منتقل ہوسکتے ہیں۔ اس لیے اس تفریق کو ختم کرنے کی سنجیدہ کوشش ہمارے ملی ایجنڈے کا نہایت اہم حصہ ہونا چاہیے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ بڑے پیمانے پر اس صورت حال کو بدلنے کی مہم چلائی جائے۔ تفریق دور کرنے کے لیے روزمرہ کے عام روابط کی بھی اہمیت ہے اور ایسے اداروں اور پلیٹ فارموں کی بھی جو دونوں فرقوں کو ملاسکیں۔ جرمن ماہر سماجیات جرگن ہابرماس نے 'عوامی دائرہ' (public sphere) کا نظریہ پیش کیا تھا۔ عوامی دائرے کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"Public sphere is made up of private people gathered together as a public and articulating the needs of society with the state."

عوامی دائرہ، ان خانگی افراد پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں اور سماج کی ضرورتوں کو ریاست کے سامنے (مشترکہ طور پر) رکھتے ہیں۔

عوامی دائرہ، سماجی زندگی کا وہ حصہ ہے جس میں افراد ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں، عوامی مسائل پر بات چیت کرتے ہیں، ایک دوسرے کی سوچ پر اثر ڈالتے ہیں اور اس طرح سیاسی عمل کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ ہابرماس کے مطابق 'زندگی کی دنیا' (Lifeworld) وہ تعلقات اور بات چیت ہے جو عام اور روزمرہ کے انسانی روابط کے ذریعے انجام پاتی ہے۔ ان میں دیہاتوں میں چوپالوں کی اور شہروں میں چائے خانوں کی بیٹھکیں، بچوں کے درمیان کھیل کے روابط، خاندانی تقریبات، میلے اور تیوہاروں کے موقعوں پر روابط وغیرہ شامل ہیں۔ ہابرماس کہتا ہے کہ یہ عوامی دائرہ ہی ہے جو نظام پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نظام ہی پورے سماج پر حکم ران ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ملک میں موجودہ مسلم دشمنی کی صورت حال کا ایک بڑا سبب رویہ کی تفریق ہے اور اس کا حل یہ ہے کہ عوامی دائرے میں مسلمان اور غیر مسلم زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب آئیں۔ ان کے درمیان بامعنی ڈائیلاگ روزمرہ کی بنیاد پر ہو۔ وہ اپنا دین، اپنے اصول اور اپنے عقائد کی تفہیم بھی کریں۔ دعوت دین مسلمانوں کا فریضہ اور ان کی ذمے داری کا تقاضا بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مل کر مشترک عوامی دائرہ بنائیں، یعنی عدل وانصاف کے ایجنڈے کو لے کر مشترک جدوجہد کریں۔ اس تناظر میں عدل کی سیاست کی جو بحث اشارات میں ہم مسلسل چھیڑے ہوئے ہیں، اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

حکمت عملی کا تیسرا جز: حکومتوں سے، ہندتو کے علم برداروں سے، اور سول سوسائٹی سے بامقصد انگیج منٹ

حکومت اور ہندتو کی طاقتوں کے نامناسب اقدامات، پالیسیوں اور نظریات کی ہم شدید مخالفت کریں، فرقہ پرست عناصر کو سماج میں الگ تھلگ بھی کریں لیکن ساتھ ہی حکومت اور ہندتو کے علم برداروں سے بامقصد مذاکرات بھی شروع ہوں۔ اب یہ تحریک ملک کی ایک نہایت موثر تحریک ہے۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ اس کے تمام عناصر ایک جیسے نہیں ہیں۔ خود اس تحریک کو ممکنہ حد تک اعتدال کی طرف جھکایا جائے اور اس میں نسبتاً اعتدال پسند عناصر کی قوت بڑھے، یہ اب ملک کی اور ملت کی بھی اہم ضرورت ہے۔ حکومت کے قریبی اعتدال پسند دانش وروں اور ارباب اختیار پر اثر انداز ہونے اور ان کے ذریعے حکومت کی پالیسیوں کو ممکنہ حد تک اعتدال پر رکھنے کی جدوجہد ہونی چاہیے۔ ہم دائیں بازو سے بھی اختلاف رکھتے ہیں اور بائیں بازو سے بھی۔ جمہوریت کی بقا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ کے مشترکہ مقصد کے لیے ہم بائیں بازو سے بھی اشتراک کر سکتے ہیں اور دائیں بازو کے معتدل عناصر کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نظریاتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر ہم ملک کے ان تمام طبقات کے ساتھ جڑنے کی کوشش کریں جو بنیادی حقوق، عدل وانصاف اور امن وامان کے معروف تقاضوں اور اقلیتوں کے حقوق کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف ہو اور وہ ترقی کریں۔

یہ انگیج منٹ کیسا ہو اور اس کی بنیادیں کیا ہوں، اس پر ہم دسمبر ۲۰۲۲ء سے مئی ۲۰۲۲ء تک کے اشارات میں تفصیل سے اپنی بات رکھ چکے ہیں۔ مثلاً تاریخ کے حوالے سے جو بحثیں اٹھائی جا رہی ہیں، ان میں ہم کیسے حصہ لیں اور کیا بولیں اس پر ہم نے گزشتہ ماہ (مئی ۲۰۲۲ء) تفصیل سے اپنی معروضات پیش کی تھیں۔ ان مباحث میں متعدد باتیں ایسی ہیں جو ہندتو کے نسبتاً معتدل عناصر کے ساتھ نقطہ اشتراک بھی بن سکتی ہیں۔ اس وقت بھی اصل ہندتو فکر میں یقین رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد حکومت کی معاشی پالیسیوں کے خلاف ہے۔ عدل پر مبنی ہمارا معاشی تصور، دین دیال اپادھیائے کے تصورات کے حامیوں کے ساتھ کامن گراونڈ بن سکتا ہے۔

اس انگیج منٹ سے ہم کو اپنے رویوں کی ان کمزوریوں کا بھی احساس ہوگا جن کی وجہ سے ہم نادانستہ ان عناصر کی تقویت کا اور ان کے جذبہ حسد کو فروغ دینے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ تمسخر، تضحیک، طنز وطعنے اور اپنی تہذیبی برتری کا موقع بے موقع متکبرانہ اظہار، حمیت جاہلانہ کو بھڑکانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ قرآن مجید میں معبودان باطل تک کو برا بھلا کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

ترجمہ: ''اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں برا بھلا نہ کہو کہ وہ بھی بغیر علم کے حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کو بُرا بھلا کہیں گے۔'' (الانعام:۱۰۶)

حکمت عملی کا چوتھا جز: عدل پر مبنی سیاست

یہی وہ تناظر ہے جس میں ہم عدل پر مبنی سیاست کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کے اصولوں اور ان کے دین کا تقاضا ہے بلکہ اس ملک میں بہتر مستقبل اور باعزت زندگی کا راستہ بھی یہی ہے کہ مسلمان اپنے خول سے نکلیں اور پورے ملک اور ملک کے تمام عوام کی دنیا وآخرت کی بھلائی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ ان کی شناخت، عام دھارے سے کٹی ہوئی، نامعلوم روایات اور انجان قدروں کی حامل ایک اجنبی قوم کی نہ رہے بلکہ ملک کے تمام انسانوں کی بھلائی اور ان کے فوز وفلاح کے علم بردار ایک متحرک، فعال اور دردمند گروہ کی بنے۔ موجودہ حالات کے پیچھے اللہ کی مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اس بات کا ادراک پیدا کریں اور اپنے سابقہ طرز عمل کو بدل کر نئی شناخت اور نئے ولولے کے ساتھ آگے آئیں۔

اس کام کے لیے درج ذیل پانچ نکات تجویز کر کے ہم یہ بحث مکمل کرتے ہیں۔

ہم اسلام کی دعوت لوگوں کو دیتے رہیں، مکمل اسلام کا اور اسلامی نظام کا تعارف کراتے رہیں۔ یہ ہمارا اصل کام ہو۔ ہم اسلام اور اس کے اصولوں پر پوری استقامت سے قائم بھی رہیں اور اپنی زبان سے، عمل سے، اپنے ارادوں سے، غرض ہر چیز سے اسلام کی شہادت بھی دیتے رہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اور اس کے متوازی، عدل وقسط کے جس قدر بھی قریب جانا ممکن ہو، قریب جانے کی اور پورے سماج کو لے جانے کی کوشش کریں۔ یہ عدل سب کے ساتھ ہو۔ اس ملک کے تمام انسانوں کو عدل ملے، یہ ہمارا فوری سیاسی ہدف بنے۔ عدل وقسط کی بنیاد پر ہمارا ایک سیاسی ایجنڈا اور ایک سیاسی وژن تشکیل پائے۔ اس ایجنڈے کو اسی سلسلہ مضامین میں ہم تفصیل سے واضح کر چکے ہیں۔ ان پر مباحث ہوں اور ایک ملی ایجنڈا واضح ہو کر سامنے آئے۔

اس ایجنڈے کو ہم اپنی تمام سیاسی کوششوں کی بنیاد بنا دیں۔ اسے مہمات کا موضوع بنائیں۔ جگہ جگہ عوامی حلقوں میں انہیں زیر بحث لائیں۔ اس پر تفصیلی لٹریچر تیار ہو۔ ویڈیو اور فلمیں بنیں۔ لوگوں کے درمیان ان باتوں کو لے کر ہم جائیں اور مسلسل کوشش کریں۔ یہ 'عوامی دائرے' کی اور اس میں ہماری شمولیت کی بنیاد بنے۔ یہاں تک کہ اسلام کی دعوت اور عدل کا یہ ایجنڈا ہماری پہچان بن جائے۔

یہ ایجنڈا ہی ہمارے سیاسی مذاکرات (Negotiation) کی اور انگیجمنٹ کی بنیاد بنے۔ حکومت سے، سیاسی پارٹیوں سے، اسی ایجنڈے کو لے کر ہم بات کریں اور اسی کو لے کر عوامی سیاست کریں۔ اس کی بنیاد پر سیاسی پارٹیوں پر اثر انداز ہوں اور اس کے لیے چھوٹے بڑے فورم بھی کھڑے کریں۔

(بحوالہ: ماہنامہ ''زندگی نو'' نئی دہلی۔ جون ۲۰۲۲ء)

برقی گاڑیوں کی ریس

Neal E. Boudette

گزشتہ سال جنرل موٹرز نے یہ دھماکا خیز اعلان کیا تھا کہ اس کے پاس بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کی تیاری اور فروخت کے حوالے سے ایک زبردست منصوبہ ہے۔ اس اعلان میں کمپنی کی طرف سے یہ بھی بتا دیا گیا کہ وہ ۲۰۳۵ء تک پیٹرول اور ڈیزل سے چلنے والی گاڑیوں کی مینوفیکچرنگ بند کر دے گی مگر ایک سال بعد کچھ دیگر آٹو میکر کمپنیاں بہتر پالیسیوں کے ساتھ اس میدان میں اتر پڑیں اور انہوں نے بھی بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کی تیاری کا اعلان کر دیا۔ معروف امریکی کمپنی ٹیسلا نے اس سال کی پہلی سہ ماہی میں دنیا بھر میں ۳ لاکھ ۱۰ ہزار سے زائد برقی کاریں فروخت کی ہیں جبکہ جنرل موٹرز اگر چین کے ساتھ جوائنٹ وینچر میں بنائی گئی گاڑیاں اس میں شامل نہ کرے تو وہ اس میدان میں ٹیسلا سے کہیں پیچھے ہے۔ اس نے اس سہ ماہی کے دوران پورے امریکا میں ۵۰۰ سے بھی کم برقی گاڑیاں فروخت کی ہیں۔ فورڈ موٹر نے ابھی حال ہی میں F-150 نامی ایک برقی پک اپ ٹرک کی تیاری شروع کر دی ہے اور گاہکوں نے اس کے پاس ۲ لاکھ ٹرکوں کی بکنگ کرائی ہے، تاہم جنرل موٹرز کی چیف ایگزیکٹو میری بارا کو اس حوالے سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ میرے خیال میں جنرل موٹرز کو اپنے حریفوں کے مقابلے میں بجلی کی سستی گاڑیاں بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے ان لاکھوں کروڑوں خریداروں کے دل جیت سکیں جو اس وقت تو نہیں مگر آنے والے دنوں میں بجلی سے چلنے والی گاڑیاں خریدنے کی خواہش رکھتے ہیں۔

گزشتہ سال امریکا بھر میں ڈیڑھ کروڑ کاریں اور ٹرک فروخت ہوئے جن میں سے ۳ فیصد بجلی سے چلنے والی گاڑیاں تھیں۔ جیسے جیسے برقی گاڑیوں کی فروخت میں اضافہ ہوتا جائے گا، جنرل موٹرز کو توقع ہے کہ ان گاڑیوں کی لاگت میں بھی کمی آتی جائے گی۔ پھر اسے آنے والے برسوں میں اپنے حریفوں کے ساتھ مسابقت کا بہتر موقع مل سکے گا اور وہ اس عشرے کے خاتمے سے قبل ہی ای وی گاڑیوں کی فروخت میں ٹیسلا کو چیلنج کر سکے گی۔ ڈیٹرائٹ کے شمال میں وارن میں واقع جنرل موٹرز کے ٹیکنیکل سینٹر میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے میری بارا نے بتایا ''ہم ایک طویل گیم کھیل رہے ہیں اور مجھے بہرصورت اس گیم میں فتح سے ہمکنار ہونا ہے''۔ اس حکمت عملی کا بنیادی نکتہ وہ بیٹری پیک ڈیزائن ہے جسے جنرل موٹرز نے گزشتہ پانچ برسوں کے دوران عملی شکل دی ہے۔ اس بیٹری کو ''الٹریم'' کا نام دیا گیا ہے جو لیگو لائک (Lego-like) ماڈیولز کی مدد سے بنایا گیا ہے جنہیں مختلف سائز میں جوڑا جا سکتا ہے اور انہیں جنرل موٹرز کی چھوٹی کار سے لے کر بڑے سائز کے پک اپ ٹرک تک سب میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ تمام ماڈیولز میں ایک جیسے پارٹس ہی استعمال ہوتے ہیں، اس لیے جنرل موٹرز کی انتظامیہ یہ سمجھتی ہے کہ اس وجہ سے انہیں مارکیٹ میں ترجیحی برتری حاصل ہوگی اور وہ اپنی گاڑی کی لاگت میں کمی کے ساتھ ساتھ دیگر آٹو میکرز کے ساتھ بہتر انداز میں مسابقت کر سکیں گے۔

اس وقت جب جنرل موٹرز اپنے الٹریم ڈیزائن پر کام کر رہی ہے، اس نے ساتھ ساتھ اپنے ایک جوائنٹ پارٹنر کے ساتھ مل کر چار نئی فیکٹریاں بھی بنانا شروع کر دی ہیں تاکہ وہاں بڑی تعداد میں بیٹری پیکس بنائے جا سکیں اور آگے چل کر اپنی کمپنی کی بنی ہوئی برقی گاڑیوں کی لاگت کم کی جا سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جنرل موٹرز نے اپنے پرانے اسیمبل پلانٹس میں بھی ضروری تبدیلیوں کا عمل شروع کر دیا ہے تاکہ ان پر الٹریم پیکس والی بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کی مینو فیکچرنگ کی جا سکے۔ میری بارا نے یہ بات بھی نوٹ کی ہے کہ گزشتہ برس امریکا میں بجلی سے چلنے والی جتنی بھی گاڑیاں فروخت ہوئی ہیں وہ لگژری ماڈل کی گاڑیاں ہیں اور انہیں ایسے لوگوں نے خریدا ہے جن کے پاس پہلے سے کم از کم دو گاڑیاں موجود تھیں۔ جنرل موٹرز کچھ اسی قسم کی گاڑیاں مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کر رہی ہے۔ ان میں سے ایک جی ایم سی ہمر پک اپ بھی شامل ہے جسے مارکیٹ میں ایک لاکھ ۱۰ ہزار ڈالر میں فروخت کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح ایک لگژری اسپورٹس وہیکل کاڈیلیک لیرک بھی بیچی جا رہی ہے۔ میری بارا کا مزید کہنا تھا کہ اگر آپ برقی گاڑیوں کی مارکیٹ میں سے ۱۰۰ فیصد یا حتیٰ کہ ۵۰ فیصد حصہ بھی لینا چاہتے ہیں تو آپ کو ایسی گاڑیاں بنانے کی ضرورت ہے جسے ایک عام اور اوسط آمدنی والا شہری بھی آسانی سے خرید سکے۔ ایسی صورتحال میں آپ کو مارکیٹ میں برقی گاڑیوں کا ''انٹری ماڈل'' فروخت کے لیے پیش کرنا پڑے گا۔

گائیڈ ہاؤس انسائیٹس کے ایک تجزیہ کار سیم ابوالصمد کہتے ہیں کہ جنرل موٹرز کی تھیوری کی حد تک حکمت عملی یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گاڑیوں کی لاگت میں کمی لائی جائے، مگر ان کے خیال میں یہ امر بالکل واضح نہیں ہے کہ برتری کا یہ پہلو کس قدر اہمیت کا حامل ہے اور جنرل موٹرز کو کب تک یہ برتری حاصل رہے گی؟ ان کا مزید کہنا تھا ''اگر اس وقت دیکھا جائے تو ہمیں لگتا ہے کہ گاہکوں کی اکثریت بجلی سے چلنے والے ٹرکوں کی خریداری میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہے۔ جب تک سلور یڈو بڑی تعداد میں مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کی جاتی ہیں اس وقت تک شاید فورڈ کمپنی ایک لاکھ سے زائد lightnings گاڑیاں فروخت کر چکی ہوگی''۔

جنرل موٹرز کی انتظامیہ ایسا کیوں سمجھتی ہے اس کے لیے اس کے پاس کئی دلائل موجود ہیں۔ اس کے برعکس ٹیسلا کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ سالہا سال سے اپنے بیٹری پیکس اسیمبل کر رہی ہے اور اس حوالے سے مارکیٹ میں ایک بڑا حصہ اس کے قبضے میں ہے۔ فورڈ کمپنی نے اپنا مشہور عالم برقی ٹرک F-150 Lightning جو اس وقت پیداواری مرحلے میں ہے، مارکیٹ میں فروخت کرنے کے لیے ایک شارٹ کٹ راستہ استعمال کیا ہے۔ فورڈ کمپنی اس ٹرک کے لیے بیٹری پیکس SKI نامی سپلائرز سے خریدتی ہے اور اسے پیٹرول سے چلنے والے F-150 کے ایک تبدیل شدہ ماڈل میں فٹ کر دیتی ہے۔ اتنی تیز رفتار پیش رفت کی بدولت فورڈ کمپنی اپنی برقی پک اپ مارکیٹ کو اپنے ہاتھ میں رکھنے میں کامیاب رہی ہے جو صرف بجلی سے چلنے والی گاڑیوں میں ہی استعمال ہو سکیں گی۔ وہ اپنے بیٹری پلانٹس بھی لگا رہی ہے اور اس میدان میں جنرل موٹرز کو پیچھے چھوڑ رہی ہے۔ فورڈ نے ریاست کینٹکی میں دو اور ٹینسی میں ایک بیٹری پلانٹس لگانے کا منصوبہ بنا لیا ہے، مگر یہ دو سال سے پہلے اپنی پیداوار شروع نہیں کر سکے گی۔ اگر وہ ان بیٹریوں سے اپنی برقی گاڑیاں بنانا چاہتی ہے تو اسے اپنے اسیمبل پلانٹس میں کافی تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

جنرل موٹرز کے صدر مارک ریوس کا کہنا ہے ''آپ جب کبھی اسیمبل پلانٹ کے ٹولز میں کوئی تبدیلی کرتے ہیں تو اس کی مالیاتی لاگت بڑھ جاتی ہے''۔ جنرل موٹرز اور ایل جی مل کر اوہائیو میں جو چار بیٹری پلانٹس تعمیر کر رہے ہیں ان میں سے ایک کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اس سال کے

آخر میں الٹریم پیکس کی پیداوار شروع کر دے گا۔ وہاں بنائے گئے بیٹری پیکس کو آنے والے سال میں شیورلے کی برقی گاڑیوں میں استعمال کیا جائے گا۔ جنرل موٹرز ان کی تیز رفتار فروخت پر بہت انحصار کر رہی ہے، اس کے علاوہ ان بیٹری پیکس کو سلوریڈو پک اپس، ایکینوکس اور بلیزر اسپورٹس گاڑیوں میں بھی استعمال کیا جائے گا۔ اسی طرح جنرل موٹرز کے تین دیگر بیٹری پلانٹس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بالترتیب ۲۰۲۳ء، ۲۰۲۴ء اور ۲۰۲۵ء میں اپنی پیداوار شروع کر دیں گے۔ ان پلانٹس کے بارے میں یہ منصوبہ ہے کہ یہاں بننے والی بیٹریز ان درجن بھر برقی گاڑیوں میں استعمال کی جائیں گی جو جنرل موٹرز امریکی مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس کا ہدف ہے کہ وہ ۲۰۲۶ء تک شمالی امریکا کے لیے ہر سال ایک ملین سے زائد برقی گاڑیاں تیار کیا کرے گا۔ جنرل موٹرز کے ڈائی میکر کی ۶۰ سالہ بیٹی میری بارا کی پرورش ریاست مشی گن کے شہر رائل اوک میں ہوئی تھی اور اس نے صرف ۱۸ سال کی عمر میں اس وقت ایک انٹرن کے طور پر جنرل موٹرز کے پلانٹ پر کام کرنا شروع کر دیا تھا، جب وہ ابھی کمپنی کے ٹیکنیکل کالج میں الیکٹرک انجینئرنگ پڑھ رہی تھی۔ اب یہی کالج کیٹرنگ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ جنرل موٹرز کی فیلوشپ کے ذریعے اس نے اسٹینفورڈ یونیورسٹی سے ماسٹرز ان بزنس ایڈمنسٹریشن بھی کیا تھا۔ جنرل موٹرز کی انتظامیہ میں شمولیت کے بعد وہ گلوبل مینوفیکچرنگ، ہیومن ریسورس، پروڈکٹ ڈیولپمنٹ اور سپلائی چین مینجمنٹ میں اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہی۔

۲۰۱۴ء میں میری بارا نے ڈینیل ایکرسن کے جانشین کے طور پر چیف ایگزیکٹو کی ذمہ داری سنبھالی اور ایک بڑی آٹو کمپنی کی سربراہی کرنے والی پہلی خاتون بن گئیں۔ میری بارا نے گاڑی کے اگنیشن سوئچ میں خرابی کے اسکینڈل کے دوران جنرل موٹرز کی بہترین رہنمائی کی۔ اس خرابی کی وجہ سے گاڑیوں کو حادثات پیش آئے اور ۱۰۰ سے زائد لوگ لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ میری بارا نے اس دوران متعدد فیصلے کیے جن سے یہ ثابت ہوا کہ جنرل موٹرز جو حال ہی میں دیوالیہ ہونے کے بعد اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی ہے، کوئی قدامت پسند اور لڑکھڑاتی ہوئی کمپنی نہیں ہے جسے سرمایہ کار اور کسٹمرز ایک صدی سے جانتے ہیں۔ میری بارا نے ایک ایسا اقدام کیا جس کے بارے میں تصور بھی محال تھا۔ انہوں نے کمپنی کو یورپی مارکیٹ سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ یہ وہ خطہ تھا جہاں کمپنی دو عشروں سے مسلسل خسارہ ظاہر کر رہی تھی۔ جنرل موٹرز نے اپنے تمام آپریشنز فرانس کی پیجو ایس اے کو فروخت کر دیے جو آج کل سٹیلینس کا حصہ بن چکی ہے۔ اوپل ڈویژن کو بھی سیلز میں شامل کر لیا گیا جو ۱۹۲۹ء سے جنرل موٹرز کی ملکیت تھا۔

میری بارا نے بتایا ''سالہا سال سے مسلسل خسارے میں جانے والے بزنس سے چھٹکارا پانے کے بعد ہمیں پورے مائنڈ سیٹ کو ہی تبدیل کرنے میں بہت مدد ملی۔ پوری کمپنی کو ایسے لگ رہا تھا کہ یہ اس کے لیے ایک نیا دن ہے''۔ جنرل موٹرز عرصے سے اس بات کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتی تھی کہ ہم اپنی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہیں۔ اس نے ایک ایسی آٹو میٹڈ گاڑی متعارف کرائی جسے کروز آٹومیشن کہا جاتا تھا۔ کمپنی نے ایک اور بے مثال کام یہ کیا کہ ہنڈا اور ٹی رو پرائس سمیت کئی سرمایہ کاروں کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تاکہ وہ ایک طرف گاڑی کی لاگت اور دوسری جانب خودکار ڈرائیونگ کار پر خرچ ہونے والے اربوں ڈالرز میں کمپنی کے حصے دار بن جائیں۔ اس کے علاوہ میری بارا نے اپنے ایک ہم عصر مسٹر ریوس کے ساتھ شراکت داری بھی کر لی، جو ۲۰۱۴ء میں کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے کے لیے امیدوار تھے۔ انہوں نے بھی اپنے والد لائڈ ریوس (جو کمپنی کے ایک سابق صدر تھے) کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا پورا کیریئر ہی جنرل موٹرز کے لیے وقف کر رکھا تھا۔

جس زمانے میں میری بارا پروڈکٹ ڈیولپمنٹ کی سربراہ تھیں، مسٹر ریوس شمالی امریکا کے انچارج تھے۔ دونوں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ کمپنی کی غیر معیاری کاریں بنانے کی شہرت سے علیحدگی اختیار کر لیں گے۔ میری بارا نے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتایا ''ہم نے ایک پیکٹ تیار کیا اور کہا کہ ہم کوئی گھٹیا کوالٹی کی کار نہیں بنائیں گے۔ اگر ہم نے کوئی کار لانچ کی تو ہم اسے کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں''۔ جن دنوں وہ کمپنی کی چیف ایگزیکٹو تھیں، وہ اور مسٹر ریوس، دونوں نے اکٹھے ترقی کی۔ مسٹر ریوس پروڈکٹ ڈیولپمنٹ کے سربراہ تھے اور انہیں ۲۰۱۹ء میں صدر کا منصب دے دیا گیا۔ گزشتہ موسم خزاں میں جب جنرل موٹرز نے سرمایہ کاروں اور تجزیہ کاروں کو ایسا وژن دینے کے لیے جمع کیا جس کی مدد سے کمپنی کے ریونیو کو دوگنا یعنی سالانہ ۲۸۰ ارب ڈالر تک بڑھایا جا سکے تو دن بھر جاری رہنے والی کانفرنس کی صدارت ان دونوں نے مشترکہ طور پر کی تھی۔ جب جنرل موٹرز نے اپنی دیرپا الیکٹرک وہیکلز پالیسی وضع کی تو ان کے معیار کے حوالے سے پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔

۲۰۱۶ء میں شیورلے بولٹ مارکیٹ میں آئی۔ یہ ایک چھوٹی کار تھی جس کی بیٹری رینج ۲۳۸ میل تھی جو ٹیسلا کی گاڑیوں سے کافی کم تھی، چنانچہ یہ مارکیٹ کو زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ ایل جی کی بنائی ہوئی بیٹری میں نقص کی وجہ سے مارکیٹ میں لائی گئی ایک لاکھ ۴۱ ہزار بولٹس گاڑیوں کو بیٹری پیکس تبدیل کرنے کے لیے واپس منگوانا پڑا۔ اس لیے گزشتہ موسم خزاں میں جنرل موٹرز کو اپنی بولٹس گاڑیوں کی مینوفیکچرنگ بند کرنا پڑی۔ پچھلے مہینے اس کی پیداوار دوبارہ شروع ہوئی۔ میری بارا کو امید ہے کہ جب برقی گاڑیوں کی دوسری لہر شروع ہوگی تو ان کی کمپنی بہت منافع کمائے گی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم بولٹس کی طرح دوبارہ کمپرومائز نہیں کریں گے۔ جنرل موٹرز کا خیال ہے کہ الٹریم ڈیزائن کی وجہ سے بیٹری پیکس کی لاگت میں ۳۰ فیصد تک کمی آ جائے گی۔

میری بارا کا مزید کہنا تھا کہ میں جب بھی ڈیزائن اور گاڑی کو دیکھتی ہوں تو مجھے یہی خیال آتا ہے کہ ہم کتنی تیزی سے اس گاڑی کو مارکیٹ میں لا سکتے ہیں؟ اگر ان کی ٹیم کو معاملے کی فوری نوعیت کا احساس دلانا مقصود ہو تو فورڈ کی طرف سے F-150 lightning نے جس طرح پرستاروں کو اکٹھا کیا تھا، یہ ایک بہترین اقدام تھا۔ میری بارا کہتی ہیں ''جب میں سوچتی ہوں کہ الیکٹرک سلوریڈو جلد مارکیٹ میں آ رہی ہے تو میرے دل سے آواز آتی ہے: یقیناً''۔

"Mary Barra's 'Long Game': Winning the E.V. Race". ("New York Times". May 12, 2022)

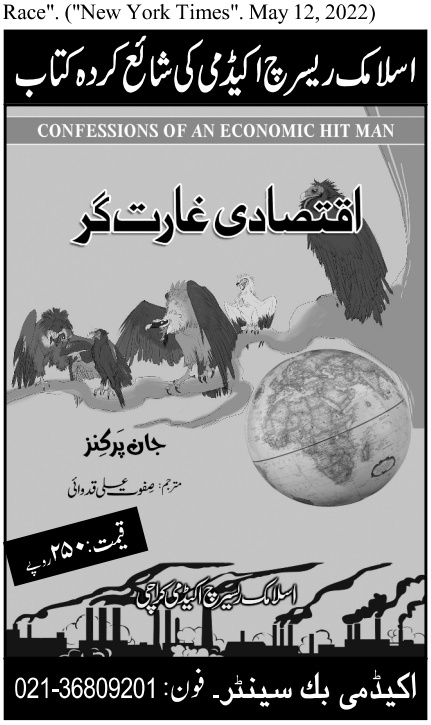

بھارت: تاریخی مساجد اور مسلم دور کے شاہکار نشانے پر

افتخار گیلانی

جنوبی ایشیا میں جہاں اس وقت پاکستان ایک سیاسی اور آئینی بحران سے گزر رہا ہے، سری لنکا ایک بدترین اقتصادی بحران کا سامنا کر رہا ہے، وہیں بھارت میں حکمران بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) اور اس کے ہمنوا اصل ایشوز سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے ہندوتوا کا چورن کامیابی کے ساتھ بیچ کر ایک کے بعد ایک جذباتی نان ایشوز ابھار کر ملک کی سب سے بڑی اقلیت مسلمانوں کو کٹہرے میں کھڑا کر رہی ہے۔ حجاب پہننے، حلال گوشت کی فروخت، مساجد میں اذان کے لیے لاؤڈ اسپیکروں کا استعمال جیسے تنازعے تھمنے کے بعد اب بس سانس ہی لے رہے تھے کہ ہندو قوم پرستوں نے یکے بعد دیگرے مسلم دور کی شاہکار یادگار تاج محل، دہلی میں سلاطین کی یادگار قطب مینار، وزیر اعظم نریندر مودی کے حلقہ انتخاب بنارس یا وارانسی میں موجود تاریخی گیان واپی مسجد اور آگرہ سے ۵۰ کلومیٹر دور متھرا کی عیدگاہ مسجد پر دعوی کر کے بتایا کہ یہ سبھی عمارتیں عہد قدیم میں ہندو عبادت گاہیں تھیں، اس لیے ان کی وہی حیثیت واگزار کرائی جائے۔ تاج محل پر دعویٰ کسی ایرے غیرے سیاسی اٹھائی گیرے نے نہیں، بلکہ ریاست اتر پردیش میں حکمران بی جے پی کے عہدیدار اور ترجمان رجنیش سنگھ نے درج کروایا۔ ان کا کہنا ہے کہ تاج محل کی بنیاد ایک مندر تیجو محل پر رکھی گئی ہے۔ حیرت تو یہ ہے، کہ جے پور کے شاہی گھرانے کی مہارانی دیا کماری، جو فی الوقت بی جے پی کی ممبر پارلیمان ہے، نے اس میں سر ملا کر دعویٰ کیا کہ مغل بادشاہ شاہجہان نے ان کے خاندان سے یہ زمین زبردستی ہتھیالی تھی۔ مغل دور میں اگر کسی نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا، تو یہ جے پور کا شاہی گھرانہ تھا۔ اس کے اراکین مغلوں کے سپہ سالار، وزیر، دیوان اور افسران تھے اور اپنی بیٹیاں مغل حکمرانوں کو رشتے میں دیتے تھے۔ دیا کماری کی ایک الیکشن مہم میں نے ان کے ہمراہ کور کی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مسلمان علاقوں میں وہ اپنے خاندان کے مغل فرمانرواں کے ساتھ تعلقات کو خوب بیچتی تھی۔ مسلمان دیہاتی بھی ان کا استقبال سادگی میں یہ نعرے لگاتے ہوئے کرتے تھے۔ ''دیکھو دیکھو کون آئی ہے، ماما جی کی بیٹی آئی ہے۔'' ماما جی کا مطلب راجہ مان سنگھ، جو جہانگیر کے ماموں تھے۔ کاش اس راجپوت خاندان کے بجائے مغلوں نے بھارت کے اصل باشندوں دلتوں، اور دیگر پسماندہ طبقات کو بااختیار بنایا ہوتا اور اسلام کے آفاقی سماجی برابری اور انصاف کے پیغام کو عام کیا ہوتا، تو جنوبی ایشیا کا سماجی نقشہ ہی الگ ہوتا۔

خیر فی الوقت جس قضیہ نے سب سے زیادہ مسلمانوں کو مضطرب کر کے رکھ دیا ہے، وہ جنوبی ایشیا کے قدیم شہر دریائے گنگا کے للتہ گھاٹ سے چند فاصلے پر واقع گیان واپی مسجد ہے۔ یہ ایک طرح سے بابری مسجد کا ری پلے ہو رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کے مسلمانوں کے ہاتھ سے جانے کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وارانسی کے سول جج روی کمار دیوا کے ذریعے مقرر کی گئی سروے ٹیم کی رپورٹ تیار ہونے سے قبل ہی عدالت نے تسلیم کر لیا کہ مسجد کے وضو خانہ میں ایک بڑا شیولنگ موجود ہے۔ اتنا ہی نہیں سپریم کورٹ نے بھی اسے شیولنگ ہی کہہ دیا۔ مورتی اور شیولنگ میں واضح فرق ہوتا ہے۔ مورتی یا مجسمہ کسی بھگوان کی شکل و شباہت کو ظاہر کرتی ہے، جبکہ شیولنگ پتھر سے بنا ایک ستون ہوتا ہے۔ اس کی کوئی واضح شکل و شباہت نہیں ہوتی ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق یہ بھگوان شیو کے عضو مخصوص کو ظاہر کرتا ہے۔ وضو خانہ کے اندر ملے جس پتھر کو شیولنگ بتایا گیا اس میں اوپر سے نیچے تک سوراخ ہیں اور اوپری حصہ چار پانچ حصوں میں کٹا ہوا ہے۔ مسجد کمیٹی کا دعویٰ ہے کہ وہاں فوارہ لگا تھا اور اس کی بنیاد کو شیولنگ بتایا جا رہا ہے۔ اس مسجد کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ اسے مغل شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر نے سترہویں صدی میں تعمیر کرایا تھا لیکن تاریخی طور پر یہ بات ثابت نہیں ہے۔ کیونکہ بعض مخطوطوں کے مطابق مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے عہد حکومت میں بھی یہ مسجد موجود تھی۔ مورخین کا کہنا ہے کہ آسام پر فوج کشی سے واپسی کے بعد جب اورنگ زیب کی فوجوں نے اس شہر میں پڑاؤ ڈالا، تو اس کے راجپوت کمانڈروں کی بیویاں مندر میں پوجا کرنے کے لیے گئیں۔ رات تک جب گجرات کے کچھ علاقہ کے مہارانا گیان سنگھ کی رانی اور اس کی دو داسیاں واپس نہیں لوٹیں، تو اگلی صبح مندر کے تہہ خانہ کی تلاشی کے دوران گیان سنگھ نے دیوار سے لگے بھگوان گنیش کے بت کو جھنجھوڑ ڈالا، تو اس کے نیچے تہہ خانے کو جاتی سیڑھیاں نظر آئیں۔ نیچے جا کر پتا چلا کہ کچھ کی مہارانی ادھ موئی پڑی تھی اور اس کے کپڑے تار تار تھے۔ اورنگ زیب نے یہ کیس کچھ کے راجا کے حوالے کر دیا، جس نے مندر کے برہمن پجاریوں کو احاطہ کے اندر ہی موجود کنویں میں پھینکوا کر، اوپر سے کنواں بند کرا دیا اور اس کے اوپر مندر کو از سر نو تعمیر کرا دیا۔ مغل بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اس مندر کی دیوار سے متصل ایک مسجد بھی تعمیر کرائی۔ مگر کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ اس نے مسجد کی مرمت کروائی، کیونکہ یہ پہلے سے ہی موجود تھی۔ یہ بھارت میں واحد مسجد ہے جو اپنے سنسکرت نام یعنی گیان واپی (علم کا کنواں) کے نام سے موسوم ہے۔ ادھر متھرا کی شاہی عیدگاہ مسجد کے خلاف بھی دائر پٹیشن بھی ضلع عدالت نے منظور کر لی ہے۔ متھرا کی شاہی عیدگاہ کی مسجد کے لیے بھی دعویٰ کیا گیا ہے۔ تقریباً ساڑھے تیرہ ایکڑ زمین پر یہ عیدگاہ مسجد بنی ہوئی ہے وہ زمین مسلمانوں کی نہیں ہے۔ اس معاملے میں ہندو فریق کی جانب سے یہ دعویٰ نہیں کیا گیا ہے کہ مندر توڑ کر یہ عیدگاہ مسجد بنائی گئی تھی۔ مسجد کی زمین کو ٹھاکر جی (بھگوان کرشن) کی ملکیت بتا کر مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس کو کرشن جنم بھومی مندر کے حوالے کیا جائے۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ متھرا کی عیدگاہ مسجد کے سلسلہ میں کئی سال قبل فریقین کے درمیان ایک سمجھوتہ بھی ہوا تھا، جس کے مطابق دونوں عبادت گاہیں قائم رہیں گی۔ اس سلسلہ میں کوئی تنازع کھڑا نہیں کیا جائے گا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ وہ سمجھوتہ غلط تھا، اس لیے ہندو فریق اب اسے نہیں مانتے۔

جب بھارت کے اتر پردیش صوبہ کے ایودھیا شہر میں ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کو مسمار کیا گیا، تو مجھے یاد ہے، تو کئی افراد کا استدلال تھا کہ اس جگہ کو ہندوؤں کے حوالے کیا جانا چاہیے تاکہ اس سے دونوں فرقوں کے درمیان نفرتیں کم ہو جائیں گی اور اس کے بدلے دیگر مساجد کے تحفظ کی ضمانت لی جا سکتی ہے۔ چونکہ انہی دنوں پارلیمنٹ نے مذہبی مقامات ایکٹ ۱۹۹۱ء بھی پاس کیا تھا، جس کی رو سے بابری مسجد کے بغیر دیگر تمام عبادت گاہوں کی پوزیشن جو ۱۹۴۷ء میں تھی، جوں کی توں برقرار رکھی جائے گی، اس لیے یہ بھی دلیل دی جا رہی تھی کہ اب بقیہ تمام مساجد کو قانونی تحفظ فراہم ہو گیا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اب گھبرانے یا خواہ مخواہ ایشو بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر اب بھارت میں پارلیمنٹ کی طرف سے پاس کیے گئے اس قانون کو کالعدم کرنے کی آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ ہندو انتہا پسند تنظیم ویشو ہندو پریشد کے نشانہ پر ملک بھر میں ۲۵ ہزار مساجد و قبرستان اور وقف کی جائیدادیں ہیں، جو ان کے مطابق عہد قدیم میں ہندو عبادت گاہیں تھیں۔

دراصل الہٰ آباد ہائی کورٹ اور بعد میں سپریم کورٹ نے جس طرح بابری مسجد کے قضیہ سے متعلق اپنے فیصلوں میں

قانون کو طاق پر رکھ کر عقیدہ کو بنیاد بنا کر مسمار شدہ مسجد کی زمین ہندو فریقین کے سپرد کی، اس سے شہہ پا کر ہندو تنظیمیں دیگر عبادت گاہوں پر حق جتا رہی ہیں۔ بابری مسجد کے کیس میں بھگوان رام کر فریق بنا کر اس کی طرف سے عرضی دائر کی گئی تھی۔ بالکل اسی طرح ان دونوں کیسوں میں بھی بھگوان وشیو یشور اور بھگوان کرشن کو فریق بنا کر عرضی دائر کی گئی ہے۔ ایک عجیب وغریب استدلال میں سپریم کورٹ نے باضابطہ رام للا کو فریق مان کر مسجد کی زمین اسی کے سپرد کی اور سماعت کے دوران یہ بھی تسلیم کیا کہ چونکہ رام للا نابالغ ہے۔ اسی لیے ویشو ہندو پریشد کی سرپرستی میں ان کے وکیل سی ایس ویدیاناتھن ان کا کیس لڑیں گے۔ مستقبل میں شاید ہی کوئی یقین کرے گا، کہ ۲۱ویں صدی میں دنیا کے کسی جمہوری ملک کی سپریم کورٹ نے ایک اساطیری شخصیت کو فریق بنا کر اس کے دلائل ریکارڈ پر لا کر اس کے حق میں فیصلہ بھی سنا دیا۔ مگر یہ اب ایک کھلی حقیقت ہے کہ قانون اور آئین کی پروا کیے بغیر عدالت نے کہا کہ Law of Limitation کا اطلاق ہندو دیوتاؤں پر نہیں ہوتا اور نہ ہی ان جگہوں پر ہوتا ہے جہاں ان دیوتاؤں کی نشانیاں ہوں۔ دوسرے لفظوں میں کسی بھی جگہ پر کوئی شخص کوئی مورتی، چاہے وہ پتھر کا ٹکڑا یا کسی درخت کی شاخ یا پتا ہی کیوں نہ ہو، رکھ کر اس پر مالکانہ حقوق جتا سکتا ہے، چاہے اس جگہ کا مالک وہاں صدیوں سے ہی مقیم کیوں نہ ہو۔ یہ بھی اب حقیقت ہے کہ سابق چیف جسٹس رنجن گوگوئی کو ریٹائرمنٹ کے بعد اسی فیصلہ کی وجہ سے ایوان بالا یعنی راجیہ سبھا کا رکن بنایا گیا۔ بنارس کی عدالت میں جب ہندو انتہا پسندوں کے وکیل نے گیان واپی مسجد پر دعوی درج کیا، تو پارلیمنٹ کے ۱۹۹۱ء کے قانون کا حوالہ دے کر اس کو پہلی سماعت کے دوران ہی خارج کر دینا چاہیے تھا۔ مگر عدالت نے کیس کو سماعت کے لیے نہ صرف منظور کیا بلکہ ایک سروے ٹیم بنا کر مسجد کے احاطہ کے سروے کرانے کا حکم دے دیا تا کہ معلوم کیا جائے کہ وہاں کسی مندر کے آثار تو نہیں ہیں۔ کیونکہ ہندو وکیل نے دعوی کیا ہے کہ مسجد دراصل پاس کے ویشو یشور مندر کا حصہ ہے۔ بالکل اسی طرح آثار قدیمہ کو بابری مسجد کی جگہ پر کھدائی کرنے کا حکم دیا گیا تھا تا کہ اس کی بنیادوں کے نیچے کسی مندر کے آثار پتا کیے جائیں۔ خیر بابری مسجد کی بنیادوں کے بارے میں آثار قدیمہ نے یہ تو رپورٹ دی کہ ۱۶ویں صدی میں جب مسجد کی بنیاد رکھی گئی تھی، اس وقت وہاں کوئی عمارت موجود نہیں تھی۔ ہاں اس جگہ پر جو آثار ملے، ماہرین کے مطابق وہ زیادہ سے زیادہ گیارہویں یا بارہویں صدی کے ہو سکتے تھے۔ یعنی مسجد کی تعمیر سے قبل ۴۰۰ سال تک اس جگہ پر کوئی عمارت موجود نہیں تھی، جس کو مبینہ طور پر مسمار کر کے مسجد بنانے کا دعوی کیا گیا تھا۔

دستور میں موجود قانون حد یعنی Law of Limitation کو نظر انداز کر کے آثار قدیمہ یا اساطیری شخصیات کو فریق بنا کر اور عقیدہ کی بنیاد پر عدالتی فیصلے دینا نہایت ہی خطرناک رجحان ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی عمارت یا جگہ ہوگی، جس کے نیچے کسی نہ کسی قدیم تہذیب کے آثار نہ پائے جائیں گے۔ اس کو اگر واقعی بنیاد بنایا گیا تو بھارت میں شاید ہی کوئی مندر بچ جائے گا، کیونکہ ایک وقت پوری آبادی نے بدھ مت اختیار کیا تھا۔ جب آدی شنکر اچاریہ نے ہندو ازم کا احیا کیا تو بدھ عبادت گاہوں کو مسمار کر کے مندر تعمیر کروائے گئے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق زمین کی عمر ۴ء۵۴ بلین سال کے لگ بھگ ہے اور اس میں انسانی آبادی کا وجود ۵۰ ہزار سال سے ہے۔ اس دوران کئی تہذیبوں یا انسانی آبادیوں نے اس کو آباد کیا۔ پھر تلاش معاش کی وجہ سے یا تو ہجرت کر کے دیگر علاقوں کی طرف چلے گئے یا جنگوں یا آفات سماوی کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئے۔ لہذا دنیا کا شاید ہی کوئی خطہ ہوگا، جہاں کھدائی کر کے کچھ نہ کچھ آثار برآمد نہیں ہوں گے۔ اسی لیے اس اندیشے کے پیش نظر کہ کوئی شخص کسی جائیداد یا جگہ پر یہ دعوی کرے کہ ہزار یا کئی سو سال قبل یہ اس کے آباواجداد کی ملکیت تھا، دنیا کے تمام ملکوں کے دستوروں میں قانون حد یعنی Law of Limitation شامل کیا گیا ہے، جس کی رو سے ایک خاص مدت کے بعد کوئی بھی عدالت ملکیتی دعوی کا کوئی بھی کیس سماعت کے لیے منظور نہیں کر سکتی ہے۔ اس قانون کی عملداری کی ایک واضح مثال لاہور کا شہید گنج گوردوارہ ہے۔ ۱۷۶۲ء میں لاہور پر سکھوں کے قبضے کے بعد اس مسجد پر ان کے فوجیوں نے ڈیرہ ڈالا اور بعد میں اس کو گوردوارہ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ ۱۸۴۹ء میں جب پنجاب برطانوی عملداری میں شامل ہوا تو مسلمانوں نے اس مسجد کی بازیابی کا مطالبہ کیا۔ پریوی کونسل نے Law of Limitation کو بنیاد بنا کر اس کا فیصلہ سکھوں کے حق میں کیا۔ ۱۸۵۰ء میں مسجد کے متولی نور احمد نے عدالت میں فریاد کی اور وہ ۱۸۸۰ء تک قانون کے مختلف دروازوں پر دستک دیتے رہے، مگر ہر بار Law of Limitation کا حوالہ دے کر عدالتیں ان کی اپیلوں کو خارج کرتی رہیں۔ پاکستان بننے کے ۷۴ سال بعد بھی یہ گوردوارہ آب وتاب کے ساتھ لنڈا بازار میں کھڑا ہے۔ لاہور میں جس طرح اس مسئلے نے جذباتی رخ اختیار کیا تھا، آزادی کے بعد اندیشہ تھا کہ اس کو دوبارہ مسجد میں تبدیل کیا جا سکتا ہے مگر کسی پاکستانی سیاستدان نے برطانوی عدالت کا فیصلہ رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا دعوی کرنے والے ملک اور اس کے موجودہ حکمرانوں کے لیے شہید گنج گوردوارے کا قضیہ ایک سبق ہے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۲۵ مئی ۲۰۲۲ء)

برطانیہ ماضی کو فراموش نہ کرے!

Patrick Gathara

ملکہ الزبتھ کی تخت نشینی کے ستر برس مکمل ہونے پر پورے برطانیہ میں کئی روزہ تقریبات نہایت اہتمام سے شروع ہو گئی ہیں۔ ان تقریبات کو ٹی وی پر دیکھتے ہوئے مجھے یہ شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ کیا برطانیہ نے اپنے مقاصد میں سے بہت کچھ حاصل کر لیا ہے؟ اس وقت بھی ملکہ برطانیہ کی صورت میں برطانیہ نے اپنی روایات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

۱۹۵۲ء میں کینیا کے دورے کے دوران ملکہ الزبتھ کو اپنے والد کے انتقال کی خبر ملی اور یوں انہوں نے ملکہ کی حیثیت حاصل کر لی۔

اس موقع پر دنیا بھر کا میڈیا چار سالہ شہزادہ لوئیس کے شاہی فضائی افواج کی پریڈ کو دیکھتے ہوئے خوشی کے جذبات اور احساسات کو بہت نمایاں کر کے دکھا رہا تھا۔ لیکن کیا عالمی میڈیا نے اس حوالے سے بھی کچھ دکھایا جب برطانیہ کی افواج نے کینیا کے پندرہ لاکھ افراد کو جبراً حراستی کیمپوں میں منتقل کر دیا تھا، جو آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے، جب برطانوی فوج تقریباً ساٹھ لاکھ بم کینیا کے شہریوں پر گرا رہی تھی۔

کیا کوئی ان دردناک پہلو پر روشنی ڈال سکتا ہے کہ کس طرح منظم اور مربوط انداز سے اپنے استعماری دور کے ان حقائق اور سچائی کو مٹایا اور چھپایا گیا۔

۲۰۱۳ء میں جب کینیا کے کچھ بزرگ افراد نے برطانیہ کے خلاف مقدمہ کیا تو انہیں یہ معلوم ہوا کہ نوآبادیاتی دور کے کم وبیش دس لاکھ دستاویزات غیر قانونی طور چھپائے گئے، جو انہوں نے مختلف ممالک سے چوری کر کے برطانیہ منتقل کیے، جسے منظر عام پر آنا چاہیے تھا۔ برطانیہ کو ان تقریبات کا انعقاد کرتے ہوئے اپنے نوآبادیاتی دور میں کیے گئے جنگی جرائم اور قتل عام کا اعتراف بھی کرنا چاہیے۔ برطانیہ اگر ماضی کے اس دردناک سچ کو بھلا بھی دے تو شاید دنیا اسے معاف نہیں کرے گی۔

(ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Queen's Platinum Jubilee: A collective misremembering of empire".
("aljazeera.com". 4 Jun 2022)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950